اسماء قادری

آرسی سیاناں کیا کیا

مکمل ناول

"حاذق! آجاؤ بیٹا' ناشتہ کرلو۔" ایک ہاتھ میں سیاہ چرمی بیگ سنبھالے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے ماتھے پر آجانے والے بالوں کو سنوارتا وہ سیڑھیاں اتر رہا تھا جب امی نے اسے پکارا۔ امی کے آواز پر اس نے نظر اٹھا کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف دیکھا وہاں ان کے ساتھ ثانیہ بھی بیٹھی تھی جو امی کے ایسے پکارنے پر یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی تھی۔

"تم بیٹھو ثانی! میں جارہا ہوں۔" حاذق نے اسے یوں کھڑے ہوتے دیکھ کر ٹوکا لیکن وہ اس کی بات کو ان سنی کرتی ہوئی تیز تیز قدموں کے ساتھ چلتی وہاں سے غائب ہوگئی۔

پچھلے دس دن سے ثانیہ کا اس کے ساتھ یہی رویہ تھا۔ ان دس دنوں میں اس نے اپنے گھرانے کی روایت توڑتے ہوئے رات کے کھانے پر سب کے ساتھ بیٹھنا قطعی ترک کردیا تھا۔

سب سے پہلے حاذق نے ہی یہ بات محسوس کی تھی۔

لاؤنج" میرس جس جگہ بھی اس کا حازق سے سامنا ہوتا تھا وہ فوراً" اس جگہ سے ہٹ جاتی تھی۔ حازق اس کی اس ناراضی کی وجہ سمجھتا تھا لیکن وہ کرہی کیا سکتا تھا وہ تو خود بہت بری طرح مجبور کردیا گیا تھا۔

"بیٹھو بیٹا! میں تمہارے لیے آملیٹ بنا کر ابھی لاتی ہوں۔" میمونہ چچی نے یقیناً ثانیہ کی حرکت دیکھی تھی اور اب شرمسار نظر آرہی تھیں۔

"نہیں چچی! میں ناشتہ نہیں کروں گا۔ طبیعت کچھ بھاری سی ہورہی ہے شاید رات کو کھانا زیادہ کھالیا تھا۔"

حازق نے انکار کیا۔ اس کا یہ بہانا کتنا بودا ہے یہ چچی اور امی دونوں ہی جانتی تھیں۔ رات اس نے ان لوگوں کے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا اور بس چکھنے کی حد تک ہی کھایا تھا۔ چنانچہ حازق کے بہانے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے قدرے سخت اور بلند آواز میں بولیں۔

"بیٹھ جاؤ حازق! اور بیٹھ کر آرام سے ناشتہ کرو۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں امی! میرا بالکل بھی کچھ کھانے کے دل نہیں چاہ رہا۔" حازق نے امی کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے جواب دیا۔ وہ آج کل ان سے نظر ملانے سے عموماً" اجتناب ہی کیا کرتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں کروٹیں لیتا دکھ اس کے دل کو بے چین کردیتا تھا۔ وہ نہ چاہنے کے باوجود کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور امی کا جیم لگا کر دیا گیا ڈبل روٹی کا سلائس آہستہ آہستہ کترنے لگا۔ نوالے اس کے حلق میں پھنس رہے تھے انہیں اس نے کھولتی ہوئی چائے کے ساتھ بہ مشکل حلق سے نیچے اتارا اور کھڑا ہوگیا۔

اپنا بیگ اٹھا کر امی اور چچی کو اللہ حافظ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ گھر سے باہر نکلتے ہی اس کے چہرے پر موجود بشاشت اور شوخی کے رنگ غائب ہوگئے اور اس نے بھنچے ہوئے لبوں کے ساتھ گاڑی مین روڈ کی طرف موڑی۔ اب اس کا ذہن ثانیہ کی ناراضی اور اپنے برابر میں خالی پڑی سیٹ میں الجھا ہوا تھا۔ بہت طویل عرصہ تو نہیں گزرا تھا جب یونیورسٹی جاتے ہوئے یہ ساتھ والی سیٹ آباد ہوتی تھی اور گاڑی میں شوخ ہنسی کی آوازیں گونجا کرتی تھیں لیکن اب لگتا تھا' وہ سارے اچھے دن خواب ہوگئے ہوں۔ وہ لاکھ چاہتا تو بھی اس خواب میں واپس نہیں لوٹ سکتا تھا اور بے بسی اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیتی تھی۔

جھنجلاہٹ کا یہ گراف اس وقت اور بھی بلند ہوگیا جب اس نے اسے معمول کے مطابق ڈپارٹمنٹ کے سیڑھیوں کے قریب ذرا ہٹ کر ایک جانب کھڑا دیکھا۔ حازق کو دیکھ کر اس کی منتظر نظروں میں چمک در آئی۔ حازق کچھ اور بھی جھنجلا گیا۔ وہی تو تھی جس کے باعث وہ ثانیہ کی نظروں میں معتوب ٹھہرا تھا۔ ایسی ہستی جس کے سبب وہ اپنے ہی گھر والوں کے سامنے شرمندہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے اندر کی ناگواری بہت واضح ہو کر اس کے چہرے پر بھی پھیل جاتی تھی لیکن اسے تو جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا تھا۔

وہ پچھلے دس دنوں سے یونہی ڈپارٹمنٹ میں حازق کی آمد کے وقت اپنی مخصوص جگہ پر کھڑی اس کی منتظر نظر آتی تھی۔

وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلتا اپنے کمرے میں جا پہنچا۔

کلاس روم کی طرف جاتے ہوئے اسے احساس تھا کہ وہ دو آنکھیں اس کی نگراں بنی ہوئی ہیں لیکن مکمل طور پر بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا۔ کلاس میں طلبا و طالبات اس کے منتظر تھے۔ حازق نے روسٹرم کے پیچھے کھڑے ہوتے ہوئے حسبِ معمول پوری کلاس پر نظر دوڑائی۔ آج بھی تین مخصوص سیٹیں خالی تھیں۔ وہ سیٹوں کے خالی پن کی وجہ تو وہ بخوبی جانتا تھا لیکن تیسری سیٹ کے خالی رہنے پر اسے تعجب تھا۔ وہ جو روزانہ صبح کی یونیورسٹی چلی آتی تھی اور حازق کی دید سے سیراب ہو کر واپس جاتی تھی' آخر کلاس میں آکر اپنی مخصوص سیٹ کیوں نہیں سنبھالتی تھی۔

☼ ☼ ☼

سینٹ مورٹیز ریسٹورنٹ کی ایک کرسی پر بیٹھی دانیہ نے خالی خالی نظروں سے شیشے کی دیوار کے اس پار نظر آتے منظر کو دیکھا۔ دیوار کے اس پار موسم سرما اپنے جوبن پر تھا۔ روئی کے گالوں کی طرح گرتی برف سے کئی بچے اور بڑے جی بھر کر محظوظ ہو رہے تھے۔ بچوں کا ایک گروپ تن دہی سے اسنومین بنانے میں مصروف تھا' ایک نوجوان جوڑا ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینک کر خوش ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ اسکیٹنگ کرتے بھی نظر آرہے تھے۔ پائن کے درختوں کے پتوں پر جمی برف اس منظر میں منفرد خوبصورتی پیدا کررہی تھی لیکن کمال کی بات یہ تھی کہ یہ منظر حقیقی نہیں تھا۔

شیشے کی دیوار کے اس پار نظر آتا منظر انسانی ذہن اور دولت کی کرشمہ سازی سے وجود میں آیا تھا۔ "امارات" نام کے اس مال میں' "اسکی دوبئی" کے نام سے موجود اس عجوبے کی تخلیق یقیناً بے انتہا قوت خرید رکھنے والے عربوں کی خواہش کی تکمیل میں عمل میں آئی تھی۔

وہ قدرت کی طرف سے عطا کیے گئے تپتے صحراؤں کی جگہ لندن' امریکہ یا کینیڈا کے موسم تو یقیناً اپنے نصیب میں نہیں لکھ سکتے تھے لیکن انہوں نے دل کو بہلانے کے لیے کچھ نہ کچھ سامان کرلیا تھا۔ سو درہم خرچ کرکے' وقت کے قلیل عرصے کے لیے ہی سہی' وہ لوگ دبئی کے اصل کو بھول کر اس پر فریب منظر سے بہل رہے تھے۔

دانیہ حسن بھی اس منظر سے متاثر ہوئی تھی لیکن بہلنا ممکن نہیں تھا۔ بہلنا ممکن ہو ہی نہیں سکتا تھا' کم از کم ایسی کسی لڑکی کا نہیں.... جس نے چند دن قبل ہی اپنی ماں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھویا ہو اور ماں بھی ایسی جو اسے کبھی پوری طرح ملی ہی نہیں تھی۔ پارٹیز' فنکشنز' میٹنگز اور شاپنگ کی مصروفیات میں گھری اس کی ماں مشکل سے ہی اس کے لیے وقت نکال پاتی تھی۔

ممی آنا" فانا" ہی اس دنیا کو اسے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ خوب صورت و مقبول مسز سونیا حسن ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں چل بسیں۔ جہاں ان کے مرنے پر لوگوں کی زبانوں پر اظہار تاسف تھا وہاں یہ دبی دبی سرگوشیاں بھی سنائی دے جاتی تھیں کہ ایکسیڈنٹ کے وقت مسز سونیا حسن شدید نشے میں تھیں اور یہ نشے میں ڈوبا ذہن ہی تھا جس نے ان کی گاڑی کو ڈگمگا کر انہیں موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔

وہ چاہتی تھی کہ اس غم کو ان دو افراد کے ساتھ بانٹ سکے جن کا اس ہی کی طرح ممی سے براہِ راست تعلق ہے لیکن اس کی یہ خواہش ادھوری رہ گئی تھی۔

اس کا اکلوتا بھائی پاکستان سے بہت دور نیویارک کی ایک یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھا۔ اس حادثے کے وقت اس کے سیمسٹر شروع ہونے میں صرف دو دن باقی تھے۔ اگر وہ ماں کے جنازے میں شرکت کرنے پاکستان آتا تو "فانا" اس کا سیمسٹر مس ہوجاتا اور یہ بات ان کے بہت اچھے بزنس مین باپ حسن شیرازی کو منظور نہیں تھی چنانچہ انہوں نے بیٹے کو اس کی ماں کے مرنے کی اطلاع نہیں دی اور دانیہ کو بھی سختی سے پابند کردیا کہ بھائی سے بات ہونے پر اسے ایسی کوئی اطلاع نہ دے۔

خود ان کے پاس بھی فرصت نہیں تھی۔ دانیہ کا غم بانٹنا تو دور کی بات ان کے پاس تو اپنی شریکِ حیات کے بچھڑ جانے کا غم منانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ ان کی بزنس کی ڈھیروں ڈھیر مصروفیات اور مسائل تھے۔ شاید بزنس کے لیے یہ جذباتیت اور رشتوں کے لیے غیر جذباتیت ہی ان کی کامیابی کی کنجی تھی۔ وہ مٹی کو بھی ہاتھ لگاتے تھے تو وہ سونا بن جاتی تھی لیکن چنانچہ بیوی کی موت کے ٹھیک پانچویں دن ایک کاروباری میٹنگ میں شرکت کے لیے دبئی روانہ ہوگئے تھے۔ دانیہ کو اپنے ساتھ دبئی لانے کا فیصلہ انہوں نے اس کی حالت کے پیشِ نظر کیا تھا۔

دبئی پہنچ کر وہ دانیہ کو تقریباً" بھول ہی گئے تھے۔ دبئی میں اپنے قیام کا پہلا دن دانیہ نے جمیرہ ہوٹل کے ایک عالی شان کمرے کی دیواروں کو تکتے ہوئے گزارا تھا اور صرف دیواروں کو تکتے ہوئے نہیں گزارا تھا بلکہ زار و قطار روتے ہوئے بھی گزارا تھا۔

حسن شیرازی جب اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر رات گئے ہوٹل واپس پہنچے تھے تو' انہوں نے دانیہ کو ابتر حالت میں پایا تھا فوراً" ہی انہوں نے ایک اچھا باپ ہونے کا ثبوت دینے کے لیے ایک پروگرام ترتیب دے دیا تھا۔ اس پروگرام کا ہی نتیجہ تھا کہ اگلے دن دانیہ جمیرہ ہوٹل کی

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے
بہنوں کے لیے ایک اور ناول
تھوڑی دور ساتھ چلو
آسیہ سلیم قریشی
قیمت ---/400 روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37- اردو بازار، کراچی۔

ایک گاڑی میں باوردی ڈرائیور کے ساتھ دبئی کے سب سے بڑی مال "امارات" کے "اسکی دبئی" کہلانے والے حصے میں پہنچادی گئی تھی۔ پھر اگلے دو دنوں میں وہ دبئی کے شاپنگ سینٹرز میں پھرتی بے تحاشا خریداری کرتی رہی تھی۔ اس کا پرس ہمہ وقت ڈالروں، درہموں اور کریڈٹ کارڈز سے بھرا رہتا تھا۔

چھٹے دن حسن شیرازی کے ساتھ پاکستان لوٹ آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم یونیورسٹی کب سے جانا شروع کروگی ثانیہ؟ بہت دن ہوگئے بیٹا اب یونیورسٹی جوائن کرلو ورنہ تمہارا سال ضائع ہوجائے گا۔" ثانیہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ اندر سے آتی میمونہ چچی کی آواز پر قطعی غیر ارادتاً وہاں رک گیا تھا۔

"میرا دل نہیں چاہتا امی! میں وہاں نہیں جانا چاہتی۔" جواباً ثانیہ کی مدھم اور افسردہ آواز سنائی دی تھی۔

"دل تو ہم سب کا ہی بہت افسردہ ہے بیٹا! لیکن زندگی کے معمولات کو جاری رکھنے کے لیے دل کی حالت کو بھلا کر بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ زندگی کبھی ایک شخص پر نہیں رُکتی۔

"مگر مجھے لگتا ہے کہ میری زندگی ایک شخص پر ختم ہوگئی ہے۔ میں نے بچپن سے لے کر اب تک کی زندگی میں کبھی تصور تک نہیں کیا تھا کہ مجھے زندگی اس شخص کے بغیر گزارنی ہوگی۔"

ثانیہ کے لہجے کا درد محسوس کرکے حازق کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ ناواقف تو نہیں تھا ثانیہ کے جذبوں سے۔

"فیصلہ تو تمہیں قبول کرنا ہی ہوگا چاہے جلد یا بدیر۔ جلد قبول کرلوگی تو زندگی آسان ہوجائے گی ورنہ وقت تمہیں احساس دلائے گا کہ تم نے اپنے ساتھ کیسی زیادتی کی۔" میمونہ چچی لگتا تھا آج زندگی کی ہر ہر تلخی ثانیہ کو سمجھا دینا چاہتی تھیں۔

"تو پھر وقت آنے پر ہی دیکھا جائے گا۔ ابھی آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔" ثانیہ کا انداز قدرے ضدی سا تھا۔

"کیسے چھوڑ دوں؟ تم ہماری اکلوتی اولاد ہو۔ تمہارے اس طرح سے گوشہ نشین ہوکر بیٹھ جانے پر تمہارے ابو کتنے پریشان ہیں تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے۔ کل حازق بھی کہہ رہا تھا کہ ثانیہ سے کہیں، اب یونیورسٹی جوائن کرلے۔ مزید چھٹیاں کیں تو انتظامیہ کی طرف سے اسے سیمسٹر ایگزام دینے سے روک دیا جائے گا۔"

میمونہ چچی کا لہجہ قدرے سخت تھا جسے ثانیہ خاطر میں نہ لائی۔

"حازق صاحب کون ہوتے ہیں میرے معاملات میں دخل دینے والے؟ میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ ان سے صاف کہہ دیں کہ آئندہ وہ میرے کسی معاملے میں قطعی دخل نہ دیں۔"

ثانیہ نے بری طرح جلبلا کر جواب دیا۔

"بدتمیزی مت کرو۔ اس نے جو کہا، تمہارے بھلے کے لیے کہا۔" میمونہ نے فوراً اسے ٹوکا۔

"مجھے ان سے کوئی بھلائی نہیں چاہیے۔ وہ میرا جتنا بھلا کرچکے ہیں، کافی ہے۔ میں ان ہی کی وجہ سے یونیورسٹی جوائن نہیں کررہی، میں وہاں جاؤں گی تو مجھے ان کی شکل دیکھنی پڑے گی اور یہ مجھے گوارا نہیں۔" ثانیہ کی آواز بلند اور لہجہ بے حد تلخ تھا۔

"کیوں خود کو اتنا جلا رہی ہو میری جان! حازق نے جو کچھ کیا، وہ اس کا حق تھا۔ جب بھابی نے اس کے فیصلے سے اختلاف نہیں کیا تو پھر تمہیں یا مجھے کیا حق پہنچتا ہے اختلاف کرنے کا۔" میمونہ اب ایک بار پھر اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کررہی تھیں۔

"انہیں حق تھا اور میں..... میرا کوئی حق نہیں تھا۔ میں کوئی نہیں ہوتی تھی جو اتنے اہم معاملے میں..... میری زندگی کے معاملے میں..... میری رائے لی جاتی۔" ثانیہ کے لہجے میں شدید صدمہ تھا۔

"دیکھو بیٹا! بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں جن میں جب تک سامنے والا آپ کا حق تسلیم کرتے۔ آپ کو حق حاصل رہتا ہے، ورنہ آپ کہیں کوئی دعوا نہیں کرسکتے، تمہارے دل میں کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو لیکن سچ یہی ہے کہ فیصلے کا حق صرف حازق اور بھابی کے پاس تھا اور انہوں نے یہ حق استعمال کرلیا۔"

میمونہ چچی ہولے ہولے ثانیہ کو سمجھا رہی تھیں۔ حازق کے لیے مزید وہاں کھڑا رہنا ممکن نہیں رہا اور وہ دل پر ایک بوجھ سا لیے وہاں سے ہٹ گیا۔ ثانیہ کا غصہ، ناراضی

احتجاج سب کچھ اس کی نظر میں جائز تھا۔ لیکن وہ ثانیہ کو کیسے بتاتا کہ اس نے وقت کے جن نازک لمحات میں وہ فیصلہ کیا، خود وہ اپنے سارے اختیارات کھو کر بے بس ہوگیا تھا۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں داخل ہوتے ہی حازق کی نظر ثانیہ پر پڑی۔ وہ کھڑکی کے پردے کے قریب بیٹھی ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب کی کیفیت تھی جسے دیکھ کر حازق کے اپنے دل میں بھی درد کی ایک لہر اٹھی۔ وہ جانتا تھا کہ ثانیہ کے چہرے پر پھیلا یہ کرب ماضی کے ایک بہت خوشگوار لمحے کی یاد تھا۔ حازق خود بھی اس لمحے میں پہنچ گیا۔

"کتنے خوب صورت اور مسحور کن خوشبو رکھنے والے پھول ہیں نا! جب یہ پودا پھیل جائے گا اور اس میں ڈھیر سارے پھول لگا کریں گے تو میں ان پھولوں کے گجرے بنا کر پہنا کروں گی۔" بڑے سے گملے میں اپنے ہاتھوں سے پودا لگانے کے بعد اس پر کھلے پھولوں کو دیکھتے ہوئے ثانیہ نے خواہش کی تھی۔

"خبردار! ہاتھ بھی نہ لگانا ان پھولوں کو۔ اتنے اجلے پھول تمہارے ہاتھ لگانے سے میلے ہوجائیں گے۔"

"میں تو ضرور ہاتھ لگاؤں گی۔ مجھے تو لگتا ہے، یہ اتنے خوب صورت پھول اللہ تعالیٰ نے بطور خاص صرف میرے لیے اس دنیا میں بھیجے ہیں۔" ثانیہ نے ٹوکے جانے کا قطعی اثر نہ لیتے ہوئے بڑے جذبے سے اپنا عزم دُہرایا۔

"اللہ رے خوش فہمی..... یہ اتنے خوب صورت پھول ان ماسی کے جلے والی خاتون کے لیے بھیجے گئے ہیں اس سورج سے بڑھ کر بھی دنیا میں کیا اندھیر ہوگا۔"

"اچھا میرے لیے نہیں ہیں تو پھر کس کے لیے ہیں؟" ثانیہ نے بہت چمک کر پوچھا تھا۔

"یہ تو کسی بہت پیاری، دل ربا، دل نشین لڑکی کے لیے ہیں جو انہیں اپنی کلائیوں میں سجائے تو اس کی کلائیوں اور ان کے پھولوں کی رنگت میں فرق کرنا مشکل ہوجائے گا۔"

"اور وہ پیاری، دل ربا، دل نشیں، موتیا کی رنگت والی لڑکی کہاں پائی جاتی ہے؟" اس بار ثانیہ نے باقاعدہ دانت کچکچا کر پوچھا تھا۔

"پاکی تو آس پاس جاتی ہے لیکن اس کی دل ربائی اور دل نشینی بس اسی دن کھل کر سامنے آئے گی جب وہ میری دلہن کا روپ دھارے گی، اس دن کم از کم اس کے ہاتھ کیچڑ سے تو نہ بھرے ہوں گے۔"

اس شوخ اور معنی خیز جملے پر ثانیہ کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی تھی اور اس سے کچھ نہ بن پڑا تھا تو اس نے دونوں پھول توڑ کر بولنے والے کو دے مارے تھے اور پھر گھر کا یہ مختصر سا لان بھرپور مردانہ قہقہوں کے ساتھ ساتھ ثانیہ کی جھینپی ہوئی شرمیلی ہنسی کی جلترنگ سے بھر گیا تھا۔

یہ لان ان خوشی بھری آوازوں سے محروم ہوچکا تھا۔ گھر کے مکینوں کی بھرپور توجہ نہ ملنے کے باعث یہاں لگے پودے بھی پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔ پہلے جیسا کچھ بھی تو نہیں رہا تھا۔ پہلے جو کچھ تھا وہ بس یاد کیا جاسکتا تھا اور یادیں ہمیشہ اپنے ساتھ درد لاتی تھیں۔ وہی درد جو کرب بن کر ثانیہ کے چہرے پر پھیلا تھا اور جس کی ٹیس حازق اپنے دل میں محسوس کررہا تھا۔ درد کے اس مشترکہ رشتے نے ہی اسے ثانیہ کے گزشتہ دنوں کے تمام تر رویّے بھلا کر اسے ثانیہ کی طرف قدم بڑھانے پر مجبور کردیا۔

"کتنے دنوں سے تم نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہ تو تمہارا سب سے پسندیدہ اور لاڈلا پودا تھا۔ دیکھو، تمہاری توجہ نہ ملنے سے کیسے مرجھانے لگا ہے۔"

وہ حازق کی آواز سن کر بری طرح چونک کر اپنے خیالوں کی دنیا سے نکلی اور اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر پھیل گیا۔ جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور مڑ کر گھر کے اندرونی حصے کی طرف جانا چاہا لیکن حازق نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک لیا۔

"چھوڑیں میرا ہاتھ، مجھے اندر جانے دیں۔" وہ چلّائی۔

"میرے ساتھ ایسا مت کرو ثانی! میرا جرم اتنا بڑا نہیں ہے کہ تم اسے معاف نہ کرسکو۔" حازق نے گویا اس سے التجا کی۔

"بہت خوب! یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے جو کچھ کیا وہ بالکل صحیح تھا۔" ثانیہ نے طنز اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں اس کی طرف دیکھا۔

"میں صحیح اور غلط کی بحث میں پڑے بغیر بس اتنا چاہتا ہوں کہ تم نارمل ہوجاؤ۔ تمہارا رویّہ صرف میری تکلیف کا باعث نہیں اس سے گھر کا ماحول بھی خراب ہورہا ہے پھر سب سے بڑھ کر تم مجھ سے نفرت میں اپنی تعلیم کا نقصان

کررہی ہو۔" حاذق نے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اوہ.... تو آپ یہ ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں کہ آپ ایک بہت نیک دل انسان ہیں جسے اس گھر اور میری بھلائی کا بہت خیال ہے۔" ثانیہ کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

"تم مانو یا نہ مانو لیکن سچ یہی ہے۔" حاذق نے جواب دیا۔

"اور شاید اسی حقیقت کی وجہ سے آپ نے وہ بلینک چیک قبول کرکے ہم سب کے جذبات کی توہین کی ہے۔ ایسی کیا کمی لگتی تھی آپ کو ہمارے اس محبتوں بھرے گھر میں جو آپ یوں بک گئے یا پھر یہ تھا کہ بولی لگانے کے لیے آنے والی وہ لڑکی اتنی حسین تھی کہ آپ کے لیے انکار کرنا ممکن ہی نہیں رہا۔ مگر کچھ تو سوچا ہوتا' کچھ تو خیال کیا ہوتا کہ آپ کیا بیچ رہے ہیں؟ کس چیز کی قیمت وصول کررہے ہیں؟"

بلند آواز میں بولتے بولتے یک دم ثانیہ کا گلا رندھ گیا اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر ٹپ ٹپ حاذق کے اس ہاتھ پر گرنے لگے جس سے اس نے ابھی تک ثانیہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

"کس نے کہی ہے تم سے یہ بات؟" شدید صدمے کے عالم میں اس نے ثانیہ سے پوچھا۔

"شاید آپ بھول رہے ہیں کہ مدیحہ عثمان میری بیسٹ فرینڈ ہے۔" ثانیہ کا جواب سن کر حاذق کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہ مدیحہ عثمان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ثانیہ کی دوست مدیحہ عثمان ایڈووکیٹ عثمان رانا کی بیٹی تھی اور یقیناً اسی کی زبانی ثانیہ تک وہ اطلاعات پہنچی تھیں جنہوں نے اس کے دل و دماغ میں حاذق کے خلاف نفرت بھر دی تھی۔

ثانیہ کی اپنے لیے نفرت کا یہ محرک جان کر وہ سن سا پڑ گیا اور ثانیہ کے ہاتھ پر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی ثانیہ تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

"آپ کو نہیں معلوم بھائی! میں نے آپ کو کتنا مس کیا۔ مجھے اکیلے' بالکل تنہا ممی کو رخصت کرنا پڑا۔ آپ کیوں نہیں تھے بھائی؟ آپ کو اس وقت یہاں ہونا چاہیے تھا۔"

اسد شیرازی سے لپٹی دانیہ زاروقطار رونے کے ساتھ ساتھ شکوے بھی کرتی جارہی تھی۔ ایک ہاتھ دانیہ کے گرد لپیٹے' دوسرے سے اس کے سر کو ہولے ہولے تھپکتے اسد کی آنکھیں شدتِ ضبط سے سرخ ہورہی تھیں۔ وہ تو امتحانوں سے فارغ ہونے کے بعد بہت خوشی خوشی کچھ دن اپنے گھر والوں اور دوستوں کے ساتھ گزارنے کے خیال سے واپس یہاں آیا تھا لیکن یہاں آکر اسے اپنی ماں کے مرنے کی خبر سننی پڑی تھی۔

یہ خبر ایسی تھی جس نے اسے دانیہ سے بھی زیادہ شدت سے متاثر کیا تھا۔ ایک تو دانیہ کی نسبت وہ ممی کا زیادہ لاڈلا تھا' وہ اس سے بہت محبت کرتی تھیں دوسرے اسے ایک احساسِ زیاں نے گھیر لیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت ان کے قریب موجود نہیں تھا۔ وہ صدمے کے ساتھ ساتھ بے یقینی کا بھی شکار تھا۔

"دانیہ! میں نے سمجھایا بھی تھا کہ اسد آئے تو خود کو اس کے سامنے کنٹرول میں رکھنا لیکن تمہیں میری بات یاد نہیں رہی۔ اب فضول میں خود بھی ہلکان ہورہی ہو اور ساتھ میں اسد کو بھی پریشان کردیا ہے۔"

حسن شیرازی جو اسد کو ایرپورٹ سے گھر لانے کے بعد خود اپنے کمرے میں چلے گئے تھے' ذرا وقفے کے بعد واپس لاؤنج میں آئے تو دانیہ کو اسد کے گلے لگ کر روتے دیکھ کر اس پر خفا ہونے لگے۔

"آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے' میں ٹھیک ہوں اور دانیہ کو پورا حق ہے کہ مجھ سے اپنا دکھ شیئر کرسکے۔"

دانیہ کے سر پر محبت بھری تھپکی دیتے ہوئے اسد نے نہایت بے رخی سے حسن شیرازی کو جواب دیا تھا۔

"تم شاید مجھ سے ناراض ہو کہ میں نے تمہیں تمہاری ممی کی ڈیتھ کی اطلاع اسی وقت کیوں نہیں دی لیکن تمہیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ میں نے ایسا تمہاری بھلائی کی خاطر ہی کیا تھا۔ تم اپنے ایگزامز چھوڑ چھاڑ کر یہاں آجاتے اور تمہارے اتنے دنوں کی محنت برباد ہوجاتی۔" وہ بہت نپے تلے انداز میں اپنے عمل کی وضاحت دینے لگے۔

"ایگزامز چھوٹ جاتے تو میں دوبارہ دے سکتا تھا۔ لیکن کیا آپ وہ لمحہ واپس لاسکتے ہیں' جس میں' میں اپنی ماں کا چہرہ آخری بار دیکھ لیتا۔" شدتِ غم سے رندھتی آواز کو قابو

میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اسد نے قدرے بلند آواز میں شکوہ کیا۔

دانیہ جواب تک اس کے گلے لگ کر رورہی تھی اس سے الگ ہوئی اور اس کے چہرے پر موجود غصے کی سرخی کو دیکھنے لگی۔

"تم ضرورت سے زیادہ جذباتی ہورہے ہو۔ میں نے جو کچھ کیا' وہ بالکل ٹھیک تھا۔" حسن شیرازی نے جذبات سے عاری لہجے میں یہ الفاظ ادا کیے اور تیز تیز قدم اٹھاتے وہاں سے باہر نکل گئے۔

اسد کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہوگیا۔

"جانے دیں بھائی! پاپا کی تھنکنگ کو ہم لوگ جانتے ہی ہیں۔ پاپا ہمیشہ جذبات پر مادی فوائد کو ترجیح دیتے ہیں۔" دانیہ' اسد کے ردعمل پر کچھ خوف زدہ سی ہوکر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اسے سمجھانے لگی تھی' اسد نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

حسن شیرازی نے ایرپورٹ سے گھر آتے ہوئے گھر کے قریب راستے میں اسے ممی کے مرنے کی اطلاع سرسری انداز میں سنا کر یوں خاموشی اختیار کرلی تھی جیسے کسی نیوز کاسٹر نے ٹی وی پر کوئی بری خبر سنانے کے بعد اس پر تبصرہ اپنے فرائض میں شامل نہ سمجھے۔ اسد شیرازی اپنے باپ کی اس سنگ دلی کو بھی خاموش نہیں کرسکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یس۔" دروازے پر دستک کی آواز سن کر مبین احمد نے کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ جواباً" دروازہ آہستگی سے کھلا اور کوئی بے آواز قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ مبین احمد اس انداز کو پہچانتے تھے' اس لیے فوراً ہی آنے والے کی طرف متوجہ ہوئے۔

"مجھے آپ سے ایک اہم سلسلے میں گفتگو کرنی تھی' وہ بھی علیحدگی میں اس لیے میں نے اس وقت آپ کو زحمت دی ہے۔" مبین احمد کے اشارے پر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے حاذق نے تمہید باندھی۔

"ارے بھئی' اب اتنے تکلف کی بھی ضرورت نہیں۔ بچپن میں تمہارا' اپنی گود میں کھلایا ہے تمہیں۔ بچپن میں دسیوں فرمائشیں پوری کروایا کرتے تھے تم مجھ سے بلا جھجک۔" مبین احمد نے فوراً ہی حاذق کو ٹوکا۔

"میں آپ سے ثانیہ کے سلسلے میں گفتگو کرنا چاہ رہا تھا۔ موجودہ حالات ثانیہ پر کس طرح اثر انداز ہوئے ہیں' اس سے ہم سب ہی واقف ہیں اور ہم سب کی ہی یہ خواہش ہے کہ جو کچھ ہوا ثانیہ اسے بھول کر نارمل زندگی میں خود کو شامل کرلے۔ اس کا بہترین حل یہی تھا کہ ثانیہ اپنے تعلیمی سلسلے کو جاری رکھے لیکن ابتدا میں صدمے کی وجہ سے اور اب ضد میں وہ اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے کے لیے تیار نہیں۔ بہت غوروخوض کے بعد میں نے اس مسئلے کا ایک حل سوچا ہے۔" حاذق نے سنجیدگی سے انہیں آمد کا مقصد بتایا۔

"کیا تجویز ہے تمہاری ثانیہ کے سلسلے میں؟" مبین احمد نے آہستگی سے پوچھا۔ حاذق دیکھ سکتا تھا کہ یہ ذکر چھیڑنے پر وہ لمحوں میں بوڑھے نظر آنے لگے ہیں۔ اس کو ایک بار پھر اس احساسِ ندامت نے گھیر لیا جو مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے پیاروں کو تکلیف میں دیکھ کر ہر بار اس پر طاری ہوجاتا تھا۔

"ثانیہ کا اس وقت جو مسئلہ ہے' وہ یہ ہے کہ وہ میری کلاس میں نہیں آنا چاہتی اور نہ ہی میرے ساتھ یونیورسٹی آنا جانا چاہتی ہے۔ آنے جانے کا مسئلہ تو خیر پوائنٹ کے ذریعے حل ہوجائے گا' اب رہا میری کلاس اٹینڈ نہ کرنے کا مسئلہ تو' اس کے لیے ایک آپشن تو یہ ہے کہ وہ میرے سبجیکٹ سے ہٹ کر کوئی دوسرا سبجیکٹ منتخب کرلے۔ آپشنل سبجیکٹ ہونے کی وجہ سے یہ ناممکن بھی نہیں' دوسرا حل زیادہ آسان ہے اور وہ یہ کہ ثانیہ میری کلاس چھوڑ کر باقی کلاسز اٹینڈ کرتی رہے اور ان سبجیکٹس کا ایگزام دے دے۔ میرے والے سبجیکٹ کا ایگزام وہ تھرڈ ایر کے ساتھ دے سکتی ہے اس کے لیے میں یہ وعدہ کرسکتا ہوں کہ میں چیئرمین صاحب سے بات کرکے ٹائم ٹیبل اس طرح سیٹ کروالوں گا کہ میرا ثانیہ کی کلاس میں کوئی پیریڈ نہ ہو۔"

حاذق جس پر ثانیہ کے تعلیمی سلسلے منقطع ہوجانے کا معاملہ ایک بہت بڑے بوجھ کی صورت میں آن پڑا تھا' اپنی سوچی ہوئی تجاویز مبین احمد کے سامنے پیش کرتا گیا۔

"میرے خیال میں تمہاری دوسری تجویز زیادہ اچھی ہے۔ اس طرح ثانیہ پر زیادہ بوجھ نہیں پڑے گا اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ اس عرصے میں وہ خود کو سنبھال کر اس لائق ہوجائے گی کہ اگر اگلے سال اسے تمہاری کلاس میں بیٹھنا

بھی پڑا تو اسے اب جتنا ناگوار نہیں گزرے گا۔" مبین احمد نے ذرا سا سوچنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"ایسا ہو جائے تو مجھے بہت اچھا لگے گا لیکن فی الحال مجھے ثانیہ سے امید نہیں کہ وہ مجھے کبھی بھی گوارا کرسکے گی۔ اس کی مجھ سے ناراضی کی بنیاد غصے پر نہیں بدگمانی پر ہے اور میں خود کو معذور پاتا ہوں کہ اس کی بدگمانی دور کرنے کے لیے کسی قسم کی وضاحت پیش کرسکوں۔ میں تو آپ کے سامنے بھی اپنے عمل کی توجیح پیش نہیں کرنا چاہتا۔ حالانکہ جانتا ہوں کہ ثانیہ جتنی نہ سہی لیکن کچھ نہ کچھ خفگی تو آپ کے دل بھی میرے لیے ہوگی۔"

حاذق کا لہجہ بہت آزردہ تھا، مبین احمد نے اس کی تکلیف کو اپنے دل میں محسوس کیا اور نہایت یقین کے ساتھ بولے۔

"میں تم سے قطعی ناراض نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ وجہ جو بھی رہی ہو، تم فیصلہ کرتے وقت ہم سب کے جذبات کو بھولے نہیں ہوگے۔ بلکہ کسی وجہ سے انہیں پس پشت رکھنے پر مجبور ہوگئے ہوگے۔ اپنے اس خیال پر مجھے اتنا اعتماد ہے کہ میں اس وجہ کو بھی نہیں جاننا چاہتا جس نے تم سے ایک انتہائی متنازعہ اور ناپسندیدہ فیصلہ کروا ڈالا۔"

"شکریہ چچا جان!" مبین احمد کے خود پر اس درجہ اعتماد پر حاذق کی آنکھیں بھیگنے لگیں تو وہ اپنے آنسوؤں سے اپنے مہربان مگر بوڑھے ناتواں چچا کو آزردہ نہ کرنے کے خیال سے تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ مگر درد تو سب کا مشترکہ ہی تھا۔ جو دکھ حاذق احمد کی پلکوں پر آنسو بن کر چمکا تھا، وہ مبین احمد کی رخساروں کو اس گرم مائع سے نہ بھگوتا یہ بھلا کیونکر ممکن تھا۔

☆ ☆ ☆

"رابعہ! تم نے دانیہ سے اس کی ممی کی ڈیتھ پر افسوس کرلیا تھا یا نہیں؟" دانیہ ایک بک شیلف کے پیچھے کھڑی کتابیں دیکھ رہی تھی کہ اسے کسی لڑکی کا پوچھا یہ سوال سنائی دیا۔ غیر اختیاری طور پر وہ رابعہ کا جواب سننے کے لیے اس طرف متوجہ ہوگئی کیونکہ رابعہ کی طرف سے اس ایک اخلاقی فریضے کی ادائیگی کے لیے وہ لاشعوری طور پر ہی سہی منتظر تو رہی تھی۔

"کہاں بھئی، موقع ہی نہیں ملا۔ شروع میں وہ کالج ہی نہیں آئی۔ بعد میں جب بھی سامنا ہوا، وہ سنبل بیگم دم چھلا بنی اس کے ساتھ تھیں اور بھئی صاف بات ہے کہ سنبل کے ساتھ وہ ہمیشہ اتنے اچھے موڈ میں ہوتی ہے کہ میرا دل نہیں چاہتا کہ اس سے جاکر اس کی ممی کی تعزیت کروں اور وہ افسردہ ہو جائے۔" رابعہ نے پوچھنے والی کو جواب دیا۔

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ویسے مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کوئی اپنی ماں کے مرنے کے بعد بھی اتنے مزے سے رہ سکتا ہے۔ پہلے دانیہ اپنی ممی کی ڈیتھ کے فوراً بعد دبئی گھومنے چلی گئی۔ وہاں سے آکر بھی ایسے مگن ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کل میں نے اسے ایک لڑکے کے ساتھ میکڈونلڈ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پتا نہیں کون لڑکا تھا۔ دانیہ کافی بے تکلف لگ رہی تھی اس کے ساتھ۔" وہی پہلی آواز دانیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے رابعہ کی معلومات میں مزید اضافہ کررہی تھی۔

"اصل میں بات یہ ہے کہ دانیہ کی کلاس ہی مختلف ہے۔ ہمارے ہاں کسی واقعے پر جو ردِ عمل ظاہر کیا جاتا ہے اس کا ان کی کلاس میں رواج نہیں ہے۔" رابعہ نے دانیہ کے رویّے کی وضاحت کے لیے وہی توجیح پیش کی جو ان کی دوستی کے خاتمے کا سبب بنی تھی۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تم یہ بات مجھ سے زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتی ہو آخر تمہاری اور دانیہ کی کافی دن دوستی بھی تو رہی ہے۔" اس لڑکی نے بھی وہی تکلیف دہ تذکرہ چھیڑ دیا تھا جو دانیہ کو آج بھی تکلیف دیتا تھا۔

"ویسے تم لوگوں کی دوستی ختم کیوں ہوگئی؟ میرے خیال میں دانیہ نے سنبل کے ملنے کے بعد تمہیں چھوڑ دیا ہوگا۔ ان امیر لوگوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ جب تک اپنا مطلب رہے ہم جیسوں کو منہ لگاتے ہیں پھر دامن چھڑا لیتے ہیں۔" تجسس سے سوال کرنے کے ساتھ اس لڑکی نے اپنی ذاتی رائے بھی پیش کی تھی۔

"نہیں خیر۔ ایسی بات تو نہیں تھی۔ سنبل سے تو دانیہ کی بہت بعد میں دوستی ہوئی، البتہ میں نے اس سے اپنی دوستی خود ہی ختم کرلی تھی۔ اصل میں میری امی کا خیال تھا کہ یہ دوستی صحیح نہیں ہے۔ وہ کہتی تھیں کہ تعلقات ہمیشہ اپنی برابری کے لوگوں سے رکھنے چاہئیں ورنہ مشکل ہو جاتی ہے اور سچ کہوں تو واقعی مجھے مشکل ہونے لگی تھی۔ دانیہ مجھے اتنے اچھے اچھے گفٹس دیتی تھی لیکن

میں اسے کچھ نہیں دے پاتی تھی۔ جب بھی دینے کا سوچتی یہی خیال آتا کہ بھلا یہ اتنی معمولی سی چیز اس کے اسٹینڈرڈ کی کہاں ہوگی۔ کینٹین میں بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر کچھ کھانے پینے سے ڈر لگتا تھا۔ ہر بار وہی بل دے دیتی تھی۔ مجھے تو اچھا خاصا کمپلیکس رہنے لگا تھا، اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ امی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس سے دوستی ہی ختم کرلوں۔ اب دیکھو، یہ فیصلہ اچھا ہی ثابت ہوا نا! وہ سنبل کے ساتھ مزے سے رہتی ہے اور میں اپنی جیسی لڑکیوں کے ساتھ خوش ہوں۔"

رابعہ واقعی بہت مطمئن لگتی تھی۔ دانیہ اپنا سر جھٹکتے ہوئے افسردہ سی وہاں سے ہٹ گئی۔ دولت، جس کے پیچھے ساری دنیا دیوانی رہتی ہے اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہوجاتی تھی۔ کبھی کبھی اسے یہی خیال آتا تھا کہ کاش وہ اتنے دولت مند گھرانے کی فرد نہ ہوتی تو کم از کم اسے اپنے ماں باپ کی محبتیں تو میسر آتیں۔ اس کی ماں اپنی کلاس کے تقاضے نبھانے کو ہر شام گھر سے باہر گزارنے کے بجائے اس کے ساتھ گزارتی اور اس کے پاپا بزنس کی الجھنوں میں ہر وقت الجھے رہنے کے بجائے کبھی ہر شام ان لوگوں کو کسی پارک میں گھمانے لے جاتے اور کبھی ان کے ساتھ انڈور گیم کھیلتے۔ پھر اسے سنبل جیسے فضول شوق رکھنے والی لڑکی کے بجائے رابعہ جیسی نرم خو لڑکی کی دوستی بھی میسر آسکتی تھی۔

ان سارے "کاش" اور تشنہ آرزوؤں کے ساتھ وہ گمان بھی نہیں کرسکتی تھی کہ متوسط اور نچلے طبقے کے لوگوں کے گھروں میں بھی کیسے کیسے مسائل پنپتے ہیں اور وہ بھی اسی کی طرح اپنی کلاس سے نکل کر دوسری کلاس میں ملنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

اسد کے پاکستان میں قیام کا عرصہ بہت تیزی سے گزر گیا۔ پاکستان میں اپنے قیام کے عرصے میں اس کا زیادہ تر وقت دانیہ کے ساتھ گزرتا تھا۔ اس کی بے انتہا توجہ نے دانیہ کو ممی کی وفات کے صدمے سے سنبھلنے میں بہت مدد دی۔ اس نے اسد کے سامنے بیٹھ کر اپنی ان تمام خواہشوں کا اظہار کیا تھا جن کے بارے میں وہ ممی کی زندگی میں سوچا کرتی تھی۔ ممی کی محبت کے حوالے سے تشنہ رہ جانے والے خوابوں پر اسد کے شانے سے لگ کر اس نے بے تحاشا آنسو بھی بہائے تھے اور پاپا کے مشینی طرزِ عمل کے شکوے بھی کیے تھے۔ اسد اس کی ہر بات بہت سکون اور توجہ سے سنتا تھا۔

اسد واپس امریکہ نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ دانیہ کی تنہائی کے خیال سے یہیں رک کر اپنی تعلیم مکمل کرنے کا خواہش مند تھا حسن شیرازی نے ایک دن دانیہ کو اپنے کمرے میں بلا کر اس بات پر سختی سے ڈانٹا تھا کہ وہ اسد کو پاکستان میں رکنے پر مجبور نہ کرے۔ دانیہ جس نے ایسی کوئی کوشش کبھی کی ہی نہیں تھی ان کے ڈانٹنے پر بہت حیران ہوئی تھی لیکن پھر پاپا کی خواہش پر اپنے طور پر اسد کو سمجھاتی رہی تھی کہ اسے واپس امریکہ چلا جانا چاہیے۔

اب معلوم نہیں یہ دانیہ کے سمجھانے کا اثر تھا یا حسن شیرازی کا دباؤ کہ اسد بہت بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ ہی سہی امریکا روانہ ہوگیا تھا۔ اپنی روانگی سے قبل وہ دانیہ کو یقین دہانی کروا کر گیا تھا کہ وہ جلد پاکستان واپس آجائے گا۔

☆ ☆ ☆

مبین احمد کے بہت سمجھانے پر ثانیہ دوبارہ یونیورسٹی جوائن کرنے پر آمادہ ہوگئی تھی لیکن یہ طے تھا کہ وہ حاذق کی کلاس اٹینڈ نہیں کرے گی۔ اس کے اس فیصلے پر کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ مصروفیت اور وقت کا مرہم آہستہ آہستہ اس کے دل پر لگے زخم کو بھی مندمل کردیتا۔ زخم ایسا تھا بھی نہیں کہ جس کے فوراً بھر جانے کے کسی کو امید ہوتی۔ دکھی تو سب ہی تھے، لیکن ثانیہ کا دکھ سب سے بڑھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس نے ایک عزیز ترین ہستی کو کھونے کے ساتھ ساتھ اپنے کچی عمر کے دیکھے خوابوں کے ٹوٹنے کا عذاب بھی سہا تھا، پھر وہ ہرٹ بھی ہوئی تھی۔

اسے حاذق کے فیصلے نے بری طرح تڑپایا تھا، خصوصاً جب سے حاذق کو یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ اس کے فیصلے کو کسی لالچ کا مرہونِ منت سمجھتی ہے تب سے تو اسے ثانیہ کے جذبات کا بہت ہی خیال رہنے لگا تھا۔

آج وہ بہت دنوں بعد قدرے پرسکون ہو کر یونیورسٹی پہنچا تھا۔ مگر اپنے ڈیپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی اس کا سارا سکون غائب ہوگیا۔ وہ حسبِ معمول آج بھی اپنی مخصوص جگہ پر موجود تھی۔ وہ ہر روز ہی اسے وہاں پا کر ڈسٹرب ہوتا تھا، لیکن نظر انداز کردیتا تھا۔ پر آج یہ ممکن نہیں تھا۔ آج ثانیہ کو بھی وہاں آنا تھا۔ فی الحال تو وہ اس

لیے نہیں پہنچ سکی تھی کہ اسے حاذق کے ساتھ آنے کے بجائے پوائنٹ سے آنا تھا۔ وہ آتی اور اس لڑکی کو اپنے سامنے پاتی تو جانے اس کا ردِ عمل کیا ہوتا۔

حاذق نے اس کے یونیورسٹی جوائن کرنے کے سلسلے میں اتنے دن جو محنت کی تھی وہ اسے دیکھ کر ایک پل میں ضائع ہو سکتی تھی۔ حاذق اس کی وجہ سے یہ دوسرا نقصان اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ چنانچہ روزانہ کی طرح خاموشی سے گزر جانے کے بجائے پل بھر کے لیے اس کے قریب رکا اور "میرے روم میں آئیے" کا مختصر حکم دیتا آگے بڑھ گیا۔ وہ اگلے ہی لمحے کچھ حیران اور جھجکی ہوئی سی اس کے کمرے میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ خوبصورت آنکھوں سے چھلکتے سوالوں کے باوجود اس نے لب کھول کر حاذق سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔

"میں نے آپ کو صرف یہ بتانے کے لیے یہاں بلایا ہے کہ آئندہ آپ مجھے ڈیپارٹمنٹ میں نظر نہیں آئیں گی۔ آج سے ثانیہ دوبارہ یونیورسٹی جوائن کر رہی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ آپ کو سامنے پا کر وہ مزید ڈسٹرب ہو۔ آپ کی وجہ سے پہلے جو نقصان ہو چکا ہے، وہی ہمیں زندگی بھر تڑپانے کے لیے کافی ہے۔ اب میں، یا میری فیملی مزید کوئی نقصان اٹھانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے پلیز..... میں ایک بار پھر آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ دوبارہ یہاں نظر نہ آئیں۔"

اس لڑکی کو قدرت نے ایسا رنگ و روپ عطا کیا تھا کہ دیکھنے والا ایک بار تو ضرور دوبارہ پلٹ کر دیکھتا تھا، لیکن حاذق احمد اس کو صاف لفظوں میں حکم دے رہا تھا کہ وہ آئندہ اسے یہاں نظر نہ آئے۔

"ٹھیک ہے۔ آئندہ میں یہاں نہیں آؤں گی۔ آپ مطمئن رہیں، میری وجہ سے آپ کی کزن کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔"

حاذق احمد کے بے حد روکھے لہجے کے جواب میں اس کا انداز بہت نرمی اور فرماں برداری لیے ہوئے تھا۔ اس نے حاذق احمد کے حکم پر پلٹ کر اس سے یہ قطعی نہیں کہا تھا کہ ثانیہ احمد کی طرح وہ بھی یونیورسٹی کی ایک طالبہ ہے اور حاذق احمد اس کے یونیورسٹی میں داخلے پر پابندی عائد کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔

"او کے۔ آپ جا سکتی ہیں۔" حاذق احمد نے اپنے سابقہ کھردرے لہجے میں حکم دیا تو وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ سر جھکا کر ڈیپارٹمنٹ سے نکلتے ہوئے اس کا رواں رواں اس سے احتجاج کر رہا تھا۔

اسے لگتا تھا کہ اس کی سانسوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ہی ہر روز ہونے والی حاذق احمد کی اس دید سے ہی مشروط ہے۔ اور اب اس نے ہی اس کی یہاں آمد پر پابندی عائد کر دی تھی۔

وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے کے باوجود ذرا سی "اف" کیے بغیر حاذق احمد کے حکم پر سر جھکا گئی تھی کہ اس کے دل میں حاذق احمد کے لیے پنپتا جذبہ ایسی ہی فرمانبرداری کا متقاضی تھا۔ اپنی اس تڑپ اور تکلیف میں مبتلا اسے علم بھی نہیں ہو سکا تھا کہ ثانیہ اسے حاذق احمد کے کمرے سے نکلتا دیکھ چکی ہے اور بری طرح جھلس رہی ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ اس کی زندگی کی طویل ترین راتوں میں سے ایک رات تھی۔ باوجود کوشش کے وہ کسی بھی طرح سونے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ حاذق احمد کے لیے دل میں پیدا ہونے والے جذبے نے رات بھر سکون سے سونے کی عادت تو یوں بھی کافی عرصے سے ترک کروا رکھی تھی۔ الارم سیٹ کر کے سونے کے باوجود اسے یہی دھڑکا رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مقررہ وقت پر آنکھ نہ کھل سکے اور وہ حاذق احمد کی صبح کی دید سے محروم ہو جائے۔ لیکن آج کی رات تو زیادہ ہی غضب کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس رات کے اختتام کے بعد وہ حسبِ معمول حاذق احمد کو دیکھنے یونیورسٹی نہیں جا سکے گی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے دیکھے بغیر اگلے دن سانس کس طرح لے گی۔ ہر دن کا آغاز حاذق احمد کی دید سے کرنا ہی اب اسے اپنی زندگی کی سب سے اولین ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ حاذق احمد کی دید اس کے لیے بالکل وہی اہمیت رکھتی تھی جیسے ہوا، پانی اور غذا کی اہمیت تھی، بلکہ اس ترتیب میں حاذق احمد کو دیکھنا ہی سب سے پہلے درجے پر آتا تھا۔ مگر اسے روکنے والا بھی حاذق احمد تھا جس کی حکم عدولی کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اپنے شاندار بیڈ روم میں، بہترین بستر پر لیٹ کر بھی اسے کسی طرح سکون نہیں مل رہا تھا۔ اس نے کتابوں میں بھی دل لگانا چاہا اور انٹرنیٹ سے بھی سر کھپایا۔ ٹی وی کے چینلز بھی بدلے اور موبائل پر الٹے سیدھے گیمز بھی

...ے کی کوشش کرتی رہی، مگر اس شب نے تو جیسے نہ ...رنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ خود بھی اس شب کے ...ے ڈر رہی تھی، کیونکہ اس کے اختتام پر جو نیا دن ...اسے حاذق احمد کی دید سے فیض یاب نہیں کرتا۔

...بھی ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں وہ اپنی بے اختیاری ...بے چینی کے باعث حاذق احمد کے حکم عدولی کی مرتکب ...ہو جائے۔ وہ پہلے ہی حاذق احمد کی نظر میں معتوب تھی، ...عدولی کے بعد تو بالکل ہی کسی لائق نہیں رہتی۔ وہ اپنی ...ہستی کی نظروں میں وعدہ خلافی کر کے مزید گرنا نہیں ...تھی، لیکن وعدہ نبھانا بھی آسان نہیں تھا۔ آخر صبح ...نے پانچ بجے اسے اپنے وعدے کو ایفا کرنے کے لیے ...ترکیب سوجھ ہی گئی۔ چار عدد گولیوں نے اتنا کام ضرور ...کیا تھا کہ صبح اٹھ کر یونیورسٹی کے لیے روانہ ہونے کا وقت ...خاموشی سے اس کی نیم بے ہوشی کے درمیان گزر ...گیا۔ بلکہ سارا ہی دن وہ دوا کی اس بھاری مقدار کی وجہ ...سے سوتی رہی۔

...میں کوئی ایسا فرد نہیں تھا جو اس کے اس خلافِ ...معمول عمل پر چونک کر متوجہ ہوتا۔ اس گھر میں رہنے والا ...مرد جو اس کا باپ کہلاتا تھا، دن بھر اپنی اولاد کی طرف ...دیکھنے کے لیے فارغ ہی نہیں ہوتا تھا اور وہ عورت ...جسے اس کا ماں، بیٹی کا رشتہ بنتا تھا، اس رشتے کو نبھانا ہی ...نہ چاہتی تھی تو پھر کون تھا جو اس کی طرف متوجہ ہوتا۔ ...خدمت پر مامور ملازم تو یوں بھی ہمیشہ خاموش تماشائی بن کر ...رہنا ہی بہتر سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ اپنے بڑے سے گھر کے ...آرام دہ سجے سجائے بیڈ روم میں سارا دن کسی لاوارث کی ...طرح بستر پر پڑی رہی۔

آخر کار شام ڈھلے اس کا وجود دوا کے اثرات سے کچھ ...آزاد ہوا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کا قیمتی سازو ...سامان سے مزین کمرا نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کمرے کی ...تاریکی اور ذہن پر چھایا اندھیرا مل کر ان تمام چیزوں کو بہت ...بھیانک بنا کر دکھا رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اس کمرے سے ...باہر بھاگ جائے۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے ...لیے اپنے جسم کی تمام تر قوت صرف کر کے بستر سے اٹھی ...لڑکھڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ مگر دوا کے اثر اور ...کمزوری کے فاقے کے باعث چکراتے دماغ نے دو قدم بعد ...ہی اس کے قوتِ ارادی کو ہرا دیا اور وہ بے جان سی ہو کر گر گئی۔

"...بی بی کو کیا ہوا؟"

وہ یقیناً کوئی ملازمہ ہی تھی، جو اس کے گرنے پر متوجہ ہوئی تھی۔ اور پھر ملازموں نے اسے اٹھا کر واپس اسی کمرے میں، اسی بستر پر پہنچا دیا تھا، جہاں سے وہ بھاگی تھی۔

"یہ گلوکوز ملا دودھ ہے۔ میں چمچے سے بی بی کو پلاتی ہوں، شاید اس طرح انہیں کچھ طاقت ملے۔ ویسے ہی اتنا کم کھاتی ہیں اور کل سے تو میں نے انہیں کچھ بھی کھاتے نہیں دیکھا۔ یقیناً کمزوری سے ہی چکرا کر گر گئی ہیں۔"

اس بار اس نے ملازمہ کی آواز شناخت کر لی تھی۔ وہ ان کے گھر کام کرنے والی سب سے پرانی ملازمہ صغریٰ تھی۔ اس کے قریب بیٹھ کر اس کے چہرے کو گیلے کپڑے سے صاف کرنے والی شاید شادو تھی۔ وہ گر کر بے ہوش نہیں ہوئی تھی، اسے صرف چکر آ رہے تھے، جو اتنے شدید تھے کہ اسے اپنا آپ ہوا میں معلق محسوس ہو رہا تھا۔ ملازمین بھی شاید اس صورتِ حال کو بھانپنے کے بعد ہی اپنی سی بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ نیم گرم گلوکوز ملا دودھ چمچے کے ذریعے اس کے منہ میں پہنچا تو اسے اپنی اس درجے کی تنہائی پر رونا آ گیا۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسو نکل کر تکیے میں جذب ہونے لگے۔ وہ اپنے منہ میں ڈالے جانے والے نیم گرم دودھ کو اپنے حلق سے اتارنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

"میرا خیال ہے ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔" اس صورت حال پر صغریٰ نے گھبرا کر خیال پیش کیا۔

اور پھر پندرہ منٹ بعد ان کے ڈرائیور نذیر کے ساتھ ایک ڈاکٹر اس کے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔

"بہت زیادہ اسٹریس اور کمزوری کے باعث ان کی یہ حالت ہے۔ فی الحال میں انہیں ڈرپ لگا رہا ہوں اور دوائیں بھی لکھ کر دے رہا ہوں۔ کچھ حالت بہتر ہو تو انہیں کچھ کھلانے پلانے کی کوشش کرنا۔ یہ خود سے غذا لیں گی تو ٹھیک ہو جائیں گی۔"

ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد اپنی رائے اور ہدایات دی تھیں۔ وہ ساکت پڑی اپنے اردگرد ابھرنے والی آوازیں سنتی رہی۔ ہاتھ میں محسوس ہونے والی سوئی کی چبھن پر بھی کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ ڈاکٹر ملازمین کو اس کے سلسلے میں مزید ایک دو ہدایات دینے کے بعد روانہ ہو گیا۔

"کیسی عجیب بات ہے نا خالہ! کہ ان لوگوں کے پاس کھانے پینے کے لیے دنیا بھر کی نعمتیں ہیں، پھر بھی یہ نہیں

کھاتے۔ کسی کو بتاؤ تو ہنسے گا کہ اتنے بڑے اور امیر آدمی کی اکلوتی بیٹی فاقوں کی وجہ سے اس حالت کو پہنچ گئی ہے۔" ڈاکٹر کے جانے کے بعد شادو نے یہ تبصرہ کیا تھا اور استہزا سے ہنسی بھی تھی۔

"اسی کا نام نصیب ہے۔ نصیب نہ ہو تو دنیا بھر کی نعمتیں اختیار میں ہونے کے باوجود آدمی کے حلق سے نہیں اتر سکتیں۔ میری اماں کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی نیا کپڑا یا کوئی اور چیز کسی کے پاس دیکھتیں تو ساتھ ہی یہ دعا بھی کرتیں کہ اللہ اس چیز کو برتنا بھی نصیب کرے۔ ان امیروں کے گھروں کا حال دیکھتی ہوں تو اماں کی دعا کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ کتنا کچھ ہے ان کے پاس، مگر ان کے نصیب میں ان نعمتوں کو برتنا ہی نہیں لکھا۔"

صغریٰ کے جوابی تبصرے میں افسوس اور رحم تھا۔ اسے خود پر جی بھر کر ترس آیا۔

وہ ایک بار پھر غنودگی میں چلی گئی تھی۔ اگلی صبح اس کی آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ اسے لگائی جانے والی ڈرپ رات میں ہی کسی پہر ختم ہونے کے بعد نکال دی گئی تھی۔ مگر آنکھ کھلنے کے بعد اس کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ اس کو سب سے پہلا خیال وقت کا آیا تھا اور اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا تھا۔ گھڑی کی سوئیوں پر نظر پڑتے ہی اس نے سوچا تھا کہ اسے اٹھ کر تیار ہو جانا چاہیے، تاکہ بالکل صحیح وقت پر حاذق احمد کے یونیورسٹی پہنچنے سے قبل وہاں پہنچ سکے۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی یاد آگیا کہ حاذق احمد نے اس کے یونیورسٹی آنے پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔ وہ بے دم سی ہو کر دوبارہ بستر پر گر گئی۔

وہ پورا دن اس نے بستر پر پڑے پڑے بے حد بے چینی میں گزارا۔ آخر اسے اپنے مسئلے کا ایک حل سجھائی دے ہی گیا۔

وہ حاذق احمد کی دید سے محرومی کا چوتھا دن تھا، جب اس نے صبح بہت سویرے جاگ کر ہلکا پھلکا ناشتہ کیا اور فریش ہو کر صاف ستھرے لباس میں گاڑی لے کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ آج وہ وقت سے کافی پہلے گھر سے نکل گئی تھی اور اس کی گاڑی کا رخ بھی یونیورسٹی کی طرف نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"کون سے ظلم کے پہاڑ توڑ رہا تھا میں تم لوگوں پر جو تم دونوں نے مجھ سے بغاوت کی راہ اپنالی۔ تم لوگوں کا فیوچر برائٹ ہو، تم اچھے انسٹی ٹیوٹس سے شاندار ڈگری حاصل کرو۔ کیا یہ کوئی ناجائز خواہش تھی۔ جو تم دونوں بہن بھائی نے اس طرح ملی بھگت کر کے میرے خلاف اسٹینڈ لے لیا؟"

اسد شیرازی اپنے دعوے کے مطابق پاکستان واپس آچکا تھا۔ حسن شیرازی خود اسے واپس بلانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ امریکہ واپس جانے کے بعد ایک دن بھی یونیورسٹی نہیں گیا تھا۔ حسن شیرازی کو اس کی اس حرکت کا علم اس وقت ہوا تھا جب اس کا سمسٹر گزر چکا تھا۔ ظاہر ہے اسد نے اس سمسٹر کے پیپرز نہیں دیے تھے اور حسن شیرازی کی بازپرس پر صاف بتا دیا تھا کہ وہ امریکہ میں رہ کر پڑھنے کے بجائے واپس پاکستان آنا چاہتا ہے۔

حسن شیرازی نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی، لیکن جس طرح دانیہ نے میڈیکل میں جانے سے انکار کر دیا تھا اسی طرح وہ بھی اپنی بات پر اڑا رہا تھا، بالآخر انہیں مجبور ہو کر اسے پاکستان واپس آنے کی اجازت دینی پڑی تھی اور اب اس کے واپس آنے کے بعد اسے اور دانیہ کو سامنے بٹھا کر ان سے ان کے باغیانہ رویے کی وجہ پوچھ رہے تھے۔

"آپ غلط سوچ رہے ہیں پاپا! میں نے اور بھائی نے مل کر آپ کے خلاف کوئی سازش نہیں کی۔ ہم میں سے کسی کو ایک دوسرے کے ارادے کے بارے میں قطعی کچھ معلوم نہیں تھا۔"

حسن شیرازی کے سوالوں کے جواب میں پہلے زبان کھولنے والی دانیہ تھی۔ وہ جو کہہ رہی تھی وہ بالکل صحیح تھا۔

"میں تمہاری بات مان بھی لوں تو مسئلہ وہی ہے کہ تم دونوں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا تمہیں ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ تم لوگوں کو ان حرکتوں نے میری ساری ہی پلاننگز برباد کر کے رکھ دی ہیں۔ تم لوگوں کے فیوچر کے حوالے سے میں نے ابھی سے جو انویسٹمنٹ کر رکھی تھی وہ بھی ضائع ہو گئی ہے۔" حسن شیرازی نے غصیلے لہجے میں ان دونوں کو احساس دلانے کی کوشش کی۔

"پلیز پاپا! آپ کی اسی میٹریلسٹک اپروچ نے ہمیں باغی کر دیا ہے۔ آپ ہمیں اپنی اولاد کے بجائے اپنے بزنس شیئرز سمجھتے ہیں، جن کے ذریعے زیادہ سے زیادہ پرافٹ

حاصل کیا جاسکے۔ آپ کو ہماری ذات سے متعلق ایک چیز دلچسپی ہے۔ اور وہ ہے ہمارا اکیڈمک ریکارڈ، کیونکہ اس ریکارڈ سے آپ کے مستقبل کا لاس اور پرافٹ جڑا ہوا ہے۔ لیکن زندگی صرف مالی فائدوں اور نقصان کا نام نہیں پاپا! زندگی میں ان سے بڑھ کر بھی کچھ ہے، جن کا تعلق انسان کے جذبات سے ہوتا ہے، مگر آپ یہ بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔" اس بار انہیں ٹوکنے اور اپنے جذبات کا اظہار کرنے والا اسد شیرازی تھا۔

"رَبش۔ جذبات، احساسات، یہ کس قسم کی کتابی باتیں کر رہے ہو تم؟ تم بہن، بھائی میں اتنی نان پریکٹیکل سوچ کیسے ڈیولپ ہوئی، میں سمجھنے سے قاصر ہوں؟" حسن شیرازی کے لہجے میں حقارت سی تھی۔

"آپ دونوں کی زندگی سے ہی تو سبق حاصل کیا ہے، ہم نے۔ کیا فائدہ ایسی پریکٹیکل سوچ کا کہ ایک شخص اپنی جان سے گزر جائے تو دوسرے کے پاس اس کے غم میں دو آنسو بہانے کا بھی وقت نہ ہو اور وہ اس حرکت کو وقت کا ضیاع سمجھتے ہوئے اپنے بزنس کو چار چاند لگانے میں مصروف ہو جائے۔"

اسد کو اپنی ماں کی موت کے حوالے سے حسن شیرازی کی جس بے حسی کا شکوہ تھا، وہ زبان پر چلا آیا۔

"یہ سارے بھرے پیٹ کے چونچلے ہیں صاحبزادے! اگر آپ کسی جھونپڑ پٹی میں پیدا ہوئے ہوتے اور ایک ساتھ دو، دو دن کے فاقے کرنے پڑتے تو میں آپ سے پوچھتا کہ ماں کے مرنے کا غم منانا زیادہ اہم ہوتا ہے یا اس کی میت اٹھنے کے بعد کہیں سے آئے کھانے کو حلق سے اتار کر پیٹ کی آگ بجھانا؟" حسن شیرازی اپنی ذات پر حملہ برداشت نہیں کر سکے اور بہت بلبلا کر اسد کی بات کا جواب دیا۔

"میں آپ کی دی مثال سے ایگری نہیں کرتا۔ زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے ہارنے والے انسان اور طمع اور حرص کے شکار شخص کو ایک ہی کیٹیگری میں ہرگز بھی نہیں رکھا جا سکتا۔"

"تو اب تم مجھے لالچی اور حریص سمجھتے ہو؟ تو یہی سہی۔ میں تم دونوں کے معاملے میں قطعی دخل نہیں دوں گا۔ آج سے تم دونوں اپنے فیصلوں میں آزاد ہو، جو چاہو کرو اور جیسے چاہے جیو، لیکن اتنا یاد رکھنا کہ جب پچھتاوے کا وقت آئے تو اس وقت مدد کے لیے میری طرف مت دیکھنا۔"

حسن شیرازی بہت برہمی کے ساتھ اپنا فیصلہ سنا کر وہاں سے واک آؤٹ کر گئے تھے۔ ردِعمل میں اسد بے نیازی سے شانے اچکا کر دونوں پیر سینٹرل ٹیبل پر رکھنے کے بعد کسی مشہور گانے کی دھن پر سیٹی بجانے لگا تھا، جبکہ دانیہ سپاٹ سے تاثرات کے ساتھ ساکت بیٹھی اپنے پیر کے ناخنوں کو گھورتی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

حاذق احمد کو اپنے دیے گئے حکم کا اگلے ہی دن حسبِ خواہش ردِعمل دیکھنے کو مل گیا تھا۔ وہ اگلی صبح یونیورسٹی گیا تھا تو وہ معمول کے مطابق اپنی مخصوص جگہ پر نظر نہیں آئی تھی۔ حاذق احمد نے اس بات پر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ اب وہ ثانیہ کے معاملے میں بے فکر ہو سکتا تھا، لیکن اس اطمینان کے ساتھ ایک اور عجیب سا احساس جڑا ہوا تھا۔

وہ وہاں نہیں تھی تو کچھ خالی پن سا محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے اس احساس کو اس نے معمول کے ردِعمل کا نام دینے کی کوشش کی تھی۔ جیسے عرصے تک کسی درخت یا کھمبے کو ایک جگہ دیکھنے کی عادت ہو جائے اور کسی دن وہ درخت یا کھمبا کسی وجہ سے اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو کچھ خالی خالی سا لگتا ہے، بالکل اسی طرح وہ ایک عرصے کے معمول کے بعد اپنی مخصوص جگہ پر نظر نہیں آئی تھی تو عجیب سا لگ رہا تھا۔ مگر اپنی اس لاجک سے وہ خود کتنا قائل ہوا تھا، اس کا جواب اس کی وہ بے قرار نظریں تھیں جو دوسرے دن اس کے کھڑے ہونے کی مخصوص جگہ پر بھٹک کر بہت مایوس ہو کر لوٹی تھیں۔

تیسرے دن اس نے یونیورسٹی میں داخل ہونے سے پہلے اپنے دل میں باقاعدہ اس خواہش کو جنم لیتے محسوس کیا تھا کہ وہ اسے اپنی مقررہ جگہ پر نظر آجائے۔ بعد میں وہ خود ہی اپنی اس خواہش پر بری طرح جھنجلایا تھا۔ بھلا اس کے دل کی یہ جرأت کیونکر ہو سکتی تھی کہ وہ اس لڑکی کو دیکھنے کی خواہش کرے، جس کو دیکھنا ہمیشہ اسے کوفت میں مبتلا کر دیتا تھا۔

چوتھے دن وہ اس مخصوص جگہ پر نظر تک نہ ڈالنے کا عزم لے کر گھر سے نکلا تھا۔ گھر سے روانہ ہوتے وقت اس نے کارنر پر کھڑی سلور گرے کلٹس کو یونہی سرسری نظر سے دیکھا اور اپنی گاڑی آگے نکال کر لے گیا۔ دوبارہ وہ

سلور گرے کلنس اسے ایک سگنل پر نظر آئی۔ سگنل گرین ہونے کا انتظار کرتے ہوئے اس نے یونہی اردگرد نظر ڈالی تھی' جب اس سلور گرے کلنس پر اس کی نظر پڑی' وہ بری طرح چونک پڑا۔ چونکنے کا سبب گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی لڑکی تھی۔ وہاں کھڑی دوسری گاڑیوں کے ڈرائیورز کی طرح اس کی نگاہیں سگنل لائٹس کی طرف ذرا بھی متوجہ نہیں تھیں۔

وہ پاس بجھانے والے انداز میں حاذق احمد کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اپنی اس وارفتگی میں اسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ حاذق احمد نے اسے دیکھ لیا ہے۔ حاذق احمد جو پچھلے تین دن انجانے میں اس چہرے کو کھوجتا رہا تھا اس وقت نجانے کیوں بری طرح چڑ گیا۔ اس چڑچڑاہٹ میں ہی اس نے سگنل گرین ہوتے ہی اس تیزی سے گاڑی کو بھگایا کہ سلور گرے کلنس کی ڈرائیور بہت پیچھے ہی کہیں رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"دیکھو تم خوامخواہ اسے ایشو بنا کر دوبارہ سے یونیورسٹی سے غائب ہونے کا سوچ رہی تھیں۔ وہ تو اس دن کے بعد سے دوبارہ نظر بھی نہیں آئی۔"

مدیحہ عثمان نے خاموش بیٹھی ثانیہ سے گفتگو چھیڑی۔ ثانیہ جو پہلے بہت شوخ چنچل ہوا کرتی تھی' اب بے حد خاموش رہنے لگی تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو' ورنہ جب مجھے ڈیپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی اس کی شکل دیکھنی پڑی تھی تو میرا دل چاہا تھا' میں ان ہی قدموں سے واپس لوٹ جاؤں۔ پھر میں نے اسے اس جگہ سے نکلتے دیکھا تھا' اس پر بھی مجھے شدید غصہ آیا تھا۔ آخر اس کا کیا تعلق بنتا ہے حاذق سے' جو وہ بار بار ان کے پاس جاتی ہے۔" ثانیہ کے چہرے پر غصے کی سرخی تھی۔

"تعلق تو واقعی سمجھ میں نہیں آتا۔ بس یوں لگتا ہے کہ اس لڑکی پر کوئی دیوانگی سی طاری ہے۔ ورنہ میں نے سر حاذق کو تو کبھی بھی اس کی طرف متوجہ ہوتے نہیں دیکھا۔ مجھے لگتا ہے کہ آج کل جو وہ غائب ہے تو سر حاذق نے ہی ڈانٹ ڈپٹ کر اسے یہاں آنے سے روکا ہے۔" مدیحہ کافی ذہین لڑکی تھی' اس نے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کافی ٹھیک ٹھاک اندازہ قائم کر لیا تھا۔

"جو بھی ہو' میرے لیے سب سے بڑا سکون یہ ہے کہ مجھے اس کی شکل نہیں دیکھنی پڑتی' میں اس کی شکل دیکھتی ہوں تو میری تکلیف میں اضافہ ہو جاتا ہے۔" ثانیہ کی پلکوں پر نمی در آئی تھی۔ مدیحہ نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر ہولے سے دباتے ہوئے خاموش تسلی دی۔ پھر کچھ پل کے وقفے کے بعد بولی۔

"تمہاری تکلیف کا اندازہ کر سکتی ہوں میں۔ لیکن صبر تو انسان کو کرنا ہی پڑتا ہے۔ تم نے اس وقت یونیورسٹی جوائن کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ بہت اچھا ہے۔ کم از کم تمہارے امی' ابو کے دلوں کو اتنا سکون تو ملا ہو گا کہ ان کی بیٹی زندگی کے معمولات میں حصہ لینے لگی ہے۔"

"امی' ابو کی خاطر ہی تو میں نے خود کو سنبھالا ہے' ورنہ میں کہوں تو میرا بالکل بھی دل نہیں چاہتا کہ میں اس دنیا میں ایک دن بھی مزید رہوں۔" آنکھوں کی نمی کو اپنے اندر اتارنے کی کوشش کرتی ثانیہ کی نظریں اپنی ہتھیلی کی لکیروں میں الجھی ہوئی تھیں۔

"ایسا مت سوچا کرو۔ اللہ کبھی کسی شخص کو اس کی برداشت سے بڑھ کر دکھ نہیں دیتا' اس نے تمہارے لیے بھی کوئی بہترین نعم البدل ضرور رکھا ہو گا' جو اپنے وقت پر تمہیں مل جائے گا۔ اللہ کا فیصلہ تمہارے سامنے آئے گا' تم خود اس رب کے مہربان اور رحمان ہونے کی قائل ہو جاؤ گی۔" مدیحہ کے دھیمے لہجے میں بڑا گہرا یقین تھا۔

ثانیہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور اپنے ہاتھ کی لکیروں میں الجھی رہی۔ ان لکیروں کے پیچھے سے اسے وہ منظر جھانکتا نظر آ رہا تھا' جب گھر میں اس کی منگنی کی تقریب منعقد کی گئی تھی۔ کتنا پیارا منظر تھا وہ جس میں خود اس کے اپنے چہرے کی جگمگاہٹ سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ اس روز اپنے من پسند شخص کے نام کی انگوٹھی اپنی انگلی میں پہننے کے بعد اس نے اپنی تقدیر پر رشک کیا تھا۔ وہ شخص جس کی اس نے تمنا کی تھی' بنا کسی دشواری کے اس کے نام لکھ دیا گیا تھا۔

مگر پھر ایک دن وہ ساری کی ساری خوشی اور سرشاری ملیامیٹ ہو گئی۔ وہ جو اپنی منزل سے بے حد قریب تھی' بالکل اچانک ہی ایک جلتے بلتے صحرا میں پھینک دی گئی۔ آبلہ پا اور پیاسی اس تپتے ہوئے صحرا میں سورج کے حدت کو سہتی بے سمت بھٹکتی رہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"دانیہ! تمہاری اپنی کلاس میں کسی لڑکی سے دوستی نہیں کیا؟ کل جب میں تمہارے ڈیپارٹمنٹ آیا تھا تو میں نے تمہیں بالکل تنہا دیکھا تھا۔"

وہ اور اسد رات کا کھانا کھا کر لان میں واک کر رہے تھے' جب اسد نے اس سے یہ سوال پوچھا۔ اسد نے بھی پچھلے دنوں یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا' حسن شیرازی نے اس کے اس عمل پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا' لیکن ان کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ خفا ہیں۔

"پتا نہیں کیا بات ہے؟ دوست میرے نصیب میں ہی نہیں ہیں۔ پہلے رابعہ سے دوستی کی تو اس نے میرا اعتبار نہیں کیا اور اپنے کلاس کمپلیکس کی وجہ سے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ سنبل ہماری ہی کلاس کی تھی' لیکن صاف بات ہے کہ اس کے ساتھ مجھے کبھی دلی خوشی حاصل نہیں ہوئی۔ بس گزارا تھا' پھر اس کے میڈیکل میں ایڈمیشن کے بعد ہمارے راستے الگ الگ ہو گئے' اب یونیورسٹی میں اگر میرا دل ہی نہیں چاہتا کہ کسی کو دوست بناؤں۔ بس کلاس فیلوز کے ساتھ فارمل ہیلو ہائے ہو جاتی ہے یا پھر کسی ضرورت کے وقت آپس میں بات چیت کر لیتے ہیں۔" دانیہ نے اسد کو بتایا۔

"یہ تو غلط بات ہے۔ تمہیں دوست بنانے چاہئیں۔" اسد نے اسے ٹوکا۔

"ایسا کرو' تم اس لڑکی سے دوستی کر لو۔ اس کی ہنسی کی کھنک بتاتی ہے کہ وہ زندگی سے بہت پیار کرنے والی لڑکی ہے۔ تم اس کے ساتھ رہو گی تو میرا خیال ہے' بہت اچھا فیل کرو گی۔" اسد نے کسی خیال میں ڈوبے ہوئے دانیہ کو مشورہ دیا۔

"آپ کس لڑکی کی بات کر رہے ہیں بھائی؟" دانیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی جو لڑکے لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ تمہارے ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے لائٹ گرین شلوار قمیص پر شاکنگ پنک اور لائٹ گرین کنٹراسٹ کا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ میں نے تم سے باتیں کرتے ہوئے اس کے ہنسنے کی آواز سنی تھی۔ اتنی جان دار اور زندگی سے بھرپور ہنسی تھی کہ میں اس کی طرف دیکھے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس لڑکی کی سب سے بڑی خوبصورتی یہی تھی کہ اس کے ہونٹوں سے ہی نہیں اس کی آنکھوں سے بھی ہنسی پھوٹ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے لگا کہ زندگی پوری خوبصورتی کے ساتھ اس لڑکی کے اندر بس رہی ہے۔ مجھے اس پر بے حد رشک آیا۔ اسے دیکھ کر پہلی بار میں نے جانا کہ انسان کے اندر کی خوبصورتی اور خوشی اور اس کے ظاہر کو کتنا دلکش بنا دیتی ہے۔ اسی لیے میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم اس سے دوستی کر لو۔"

اسد کسی سحر زدہ شخص کی طرح کہہ رہا تھا اور دانیہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسد شیرازی' اس کا بھائی' جو لڑکیوں کے معاملے میں کافی خشک مزاج مشہور تھا' جو اپنی ہی فراہم کردہ معلومات کے مطابق امریکہ میں کیتھرائن نامی خود پر نثار ہونے والی لڑکی پر ایک نگاہِ التفات ڈالنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا' آج اسے ایک اجنبی لڑکی کی ہنسی' اس کی خوبصورتی کے متعلق بتا رہا تھا۔ اس نے اس لڑکی کو اتنی غور سے دیکھا تھا کہ اسے اس کے کپڑوں کی رنگت اور دوپٹے کا کنٹراسٹ تک بہت اچھی طرح یاد تھا۔

"ایسے آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہی ہو؟ کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔" اسد نے اس کی حالت پر مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔ اصل میں' میں سوچ رہی تھی کہ آپ کس لڑکی کا ذکر کر رہے ہیں۔ مجھے تو بالکل بھی یاد نہیں کہ کل میری کلاس فیلوز میں سے کس نے اس کمبینیشن کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اب اگر آپ کے حکم کے مطابق میں اس لڑکی سے دوستی کرنا چاہوں تو کیسے کروں؟"

دانیہ نے اسد پر اپنی حیرانی کی وجہ ظاہر کرنے کے بجائے بات بنائی۔

"یہ کون سا بہت بڑا پرابلم ہے۔ میں پھر کسی دن تمہارے ڈیپارٹمنٹ کا چکر لگا کر تمہیں وہ لڑکی دکھا دوں گا۔"

دانیہ کو احساس ہوا کہ معاملہ لڑکی کی زندہ دلی سے متاثر ہونے پر یا دانیہ کے لیے ایک دوست تلاش کرنے تک محدود نہیں ہے' بلکہ اس لڑکی نے باقاعدہ اسد کے دل پر دستک دی ہے۔

اور پھر اگلے دن جب بغیر کسی کوشش کے ہی ڈیپارٹمنٹ میں آتے ہی اسد نے اپنی مطلوبہ لڑکی کو دیکھ کر دانیہ کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا تو اس وقت اسد کے چہرے پر جو جوش اور آنکھوں میں چمک تھی اس نے دانیہ کے یقین پر تصدیق کی مہر لگا دی تھی۔ مگر وہ اسد کی بتائی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی' اور اس نے اپنے دل میں

چپکے سے یہ خواہش کی تھی کہ کاش اس کا ہر اندازہ اور یقین غلط ثابت ہو اور اسد شیرازی کی اس لڑکی کے لیے پسندیدگی محبت کے درجے تک نہ پہنچی ہو' کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اسد کو بہت تکلیف اٹھانی پڑتی۔ اس لڑکی سے محبت کرنا اسد شیرازی کو کبھی بھی راس نہیں آسکتا' دانیہ اپنے اردگرد سے بے حد الگ تھلگ رہنے کے باوجود بھی یہ بات بہت اچھی طرح جانتی تھی۔

☼ ☼ ☼

حاذق احمد کو پورے تین دن بعد دیکھ کر اسے لگا تھا کہ اس کی اٹکی ہوئی سانسیں بحال ہو گئی ہوں' ورنہ پچھلے تین دن تو بالکل ایسے تھے جیسے وہ کسی بلند و بالا مقام پر' جہاں آکسیجن کی بے حد قلت ہوتی ہے' ہانپتے ہوئے اور بہت کھینچ کھینچ کر سانس لیتی رہی ہو۔

حاذق احمد کی دید کے لیے جو اسے یہ نئی راہ سوجھی تھی اس کی حیثیت کسی مرتے ہوئے شخص کو اچانک ایمرجنسی میں فراہم کی جانے والی آکسیجن جیسی تھی' جس نے اسے موت کی دہلیز سے واپس کھینچ لیا تھا۔ اب اسے ہر روز صبح بہت جلدی اٹھنا پڑتا تھا۔ پھر اپنے گھر سے گاڑی میں نکلنے والے حاذق احمد کی دید بھی لمحاتی سی ہوتی تھی۔

راستے میں چلتی گاڑی میں اس کا نظر آنا مشکل ہوتا تھا اور کوئی سگنل بند ملے' ایسا بھی بہت کم ہوتا تھا۔ کبھی سگنل بند ہونے کی صورت میں بھی اسے اپنی گاڑی حاذق احمد کی گاڑی کے ساتھ روکنے کا موقع نہیں ملتا تھا' مگر وہ پھر بھی خوش تھی۔

اب بھی وہ یہ خیال رکھتی تھی اور حاذق احمد کے گھر کے قریب سے لے کر چند اسٹاپس تک ہی اس کے پیچھے جاتی تھی۔ اس نے کبھی بھی یونیورسٹی تک حاذق احمد کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ مبادا ثانیہ کی نظر پڑ جائے۔ ویسے اسے حیرت تھی کہ ثانیہ اب حاذق احمد کے ساتھ اس کی گاڑی میں یونیورسٹی کیوں نہیں جاتی۔ ورنہ پہلے تو وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی آتی تھی۔ وجہ جو بھی تھی اس کے لیے' نعمت تھی' کیونکہ اگر ثانیہ معمول کے مطابق حاذق احمد کے ساتھ ہی یونیورسٹی آتی جاتی تو وہ اپنے معمول کو برقرار نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس صورت میں ثانیہ کے اسے دیکھ لینے کا امکان تھا اور حاذق احمد کی عائد کردہ پابندی کا مقصد ہی یہ تھا کہ ثانیہ اسے نہ دیکھے۔ چنانچہ وہ ثانیہ کے اس کے ساتھ نہ ہونے پر اپنے دل میں شکر ادا کرتی رہتی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ حاذق احمد سے اس کا یہ نیا معمول چھپا ہوا نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا پیچھا کرتی ہے' لیکن اس نے ابھی تک اس بات پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ جب تک اعتراض نہ کرتا' اس کا معمول جاری رہ سکتا تھا اور وہ اپنے لیے اپنی زندگی کی واحد خوشی حاصل کر سکتی تھی۔

پارکنگ ایریا میں اپنی شاندار کرولا کے ساتھ داخل ہوتے ہی اسد شیرازی کی نظر اس شخص پر پڑی جس سے آج کل وہ پوری دنیا میں سب سے زیادہ چڑا ہوا تھا بلکہ اس کے لیے اسد کے دل میں جو جذبات تھے اسے محض چڑ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ حسد کا جذبہ تھا جو اس شخص کو اپنا رقیب جانتے ہوئے اسد کے دل میں پوری شدت سے جاگ اٹھا تھا۔ کیا خاص بات تھی اس شخص میں؟ نہ وہ اسد شیرازی جتنا خوب صورت تھا اور نہ ہی مال و دولت میں اس کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ مگر پھر بھی اس شخص کو وہ اعزاز حاصل تھا جو اسد شیرازی کے تن من کو جلا کر راکھ کر رہا تھا۔

وہ لڑکی ثانیہ احمد جس کی ہنسی کی جلترنگ میں اسے زندگی کے سارے رنگ دکھائی دیتے تھے اور جسے اپنی زندگی میں شامل کر کے وہ خود بھی ان خوب صورت رنگوں میں رنگ جانا چاہتا تھا اس معمولی' بے حد عام سے شخص کے نام کی انگوٹھی' اپنی انگلی میں پہن کر گھومتی تھی اور یہ رشتہ صرف انگلی میں پہنی انگوٹھی کا رشتہ نہیں تھا۔

ثانیہ احمد کی آنکھوں اور چہرے پر اس شخص کی سنگت میں جو رنگ بکھرے نظر آتے تھے' وہ یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ وہ اس شخص کو دل و جان سے چاہتی ہے۔ مگر وہ اپنے رقیب کے مدِمقابل ڈٹ کر کھڑے ہو جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اب بھی جو اس نے اس شخص کو پارکنگ میں کھڑی سفید مہران کی طرف بڑھتے دیکھا تو اندرونی حسد کے باعث اسے تنگ کرنے کی ایک راہ نکال لی۔ اس نے اپنی کرولا اس انداز میں پارک کی کہ سفید مہران کے نکلنے کا راستہ بند ہو گیا۔

"بھائی صاحب! ذرا اپنی گاڑی اس طرف پارک کر لیں۔ یہاں گاڑی کھڑی کرنے سے تو دوسری گاڑیوں کا راستہ رک رہا ہے۔" وہ جو سفید مہران کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ اس کو اس غلط انداز میں پارکنگ کرتے دیکھ کر اس سے بولا لیکن اسد نے اس کی بات اَن سنی کر دی اور آرام سے اپنی گاڑی کو لاک کر کے وہاں سے جانے لگا۔

"جناب! میں آپ سے مخاطب ہوں۔ آپ نے اپنی گاڑی غلط پارک کی ہے۔" اسد کو جاتا دیکھ کر وہ اپنی گاڑی سے اتر آیا اور با آواز بلند اسے مخاطب کیا۔

"میری گاڑی بالکل ٹھیک پارک ہے۔" اسد نے رعونت سے جواب دیا۔

"مگر آپ کی گاڑی کی وجہ سے میں اپنی گاڑی نہیں نکال پا رہا۔" اس نے اسد کو اس کی غلطی کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

"تو میں کیا کروں؟ تمہیں اپنی گاڑی ٹھیک طرح پارک کرنی چاہیے تھی۔" اسد نے کٹ حجتی سے کام لیتے ہوئے اس کے سر ہی الزام دھرا۔

"لگتا ہے' آپ کسی سے لڑ کر آئے ہیں۔ مگر آپ کو میری پریشانی کا اندازہ نہیں ہے۔ میری کٹ کھنی بلی جیسی کزن کم منگیتر جو کیفے ٹیریا میں موجیں اڑاتے ہوئے اس بات کا انتظار کر رہی ہے کہ میں اس کے مستقبل کا شوہر اور حال کا شوفر گاڑی لے کر اس کی خدمت میں حاضر ہوں' وہ تاخیر کی صورت میں میرا حشر بگاڑ دے گی۔ اس لیے پلیز' آپ میری مظلومیت کا خیال کریں اور غلطی چاہے بے شک میری ہی ہو مگر اس وقت مہربانی کرتے ہوئے اپنی گاڑی ہٹا کر مجھے گاڑی نکالنے کا موقع عنایت کریں۔"

وہ بہت باتونی اور لاابالی مزاج کا شخص معلوم ہوتا تھا جو اسد کی تمام تر بدمزاجی کو بہت آسانی سے ہضم کر کے اس سے بہت شگفتہ انداز میں درخواست کر رہا تھا۔ اس کا اپنا ثانیہ احمد کا منگیتر اور ہونے والا شوہر جتانا اسد کو اندر تک جھلسا گیا۔

"ہٹو میرے سامنے سے' نہ جانے کس سرکس کے جوکر ہو جو میرا ٹائم ویسٹ کرنے کھڑے ہو گئے ہو۔" اسد نے باقاعدہ اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا تو وہ ہکا بکا سا رہ گیا۔ پھر یہ حیرانی بہت تیزی سے غصے میں بدل گئی اور ساتھ ہی اس کا لہجہ بھی بدل گیا۔

"آپ سمجھ کیا رہے ہیں خود کو؟ اگر کرولا میں آئے ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جو جی چاہے وہ کریں۔ میں تو صرف ایک یونیورسٹی فیلو سمجھ کر آپ سے احترام سے بات کر رہا تھا لیکن آپ کی اخلاقیات بتا رہی ہے کہ آپ اس احترام کے لائق ہی نہیں ہیں۔" اس شخص کی جون مکمل طور پر بدل چکی تھی اور وہ چہرے پر بے حد سرخی لیے اسد سے بات کر رہا تھا۔

"تم میرا دماغ ٹھکانے لگاؤ گے؟ تم..... تمہیں تو میں ایک ہاتھ سے اٹھا کر پھینک دوں گا۔" کچھ جذبۂ رقابت تھا' کچھ اسد کا اپنے مضبوط ورزشی جسم اور باپ کی دولت پر گھمنڈ جس کے زعم میں اس نے اپنے مدِمقابل کو صرف زبانی جواب دینے تک ہی محدود نہیں رکھا اور وہ اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال بیٹھا۔ اب ظاہر ہے سامنے والا بھی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	400/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	200/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	450/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	200/-
عین سے عورت	غزالہ عزیز	150/-
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھر نا جائیں خواب	آسیہ رزاقی	200/-
خواب دریچے	سعدیہ امل کاشف	150/-
اماوس کا چاند	بشریٰ سعید	200/-
رنگ خوشبو ہوا بادل	افشاں آفریدی	450/-
درد کے فاصلے	رضیہ جمیل	400/-

ناول منگوانے کے لیے فی کتاب ڈاک خرچ -/30 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 2216361

جوان خون تھا۔ چنانچہ اس کا جوابی ردِعمل بھی فوراً ہی ظاہر ہوا۔ اگلے ہی لمحے اسد اور وہ شخص آپس میں گتھم گتھا تھے اور کسی پرانے دشمن کی طرح ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"حاذق بیٹا! میں تمہارے پاس یہ درخواست لے کر آئی تھی کہ اگر ہو سکے تو ہفتے میں دو تین دن تھوڑا سا وقت نکال کر میری مریم کو پڑھائی میں مدد دے دیا کرو۔" حاذق مسرت بیگم کے بلاوے پر ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہاں کارنر کے گھر والی مسز شیخ آئی بیٹھی تھیں۔ حاذق کو سامنے پا کر انہوں نے رسمی علیک سلیک کے بعد فوراً ہی اپنا مدعا پیش کر دیا۔

"ٹھیک ہے آنٹی! آپ مریم کو مغرب کے بعد بھیج دیجیے گا۔"

حاذق محلے داری کا بہت لحاظ کرتا تھا اس لیے مسز شیخ کی درخواست فوراً قبول کر لی حالانکہ آج کل وہ یونیورسٹی کی مصروفیات کے علاوہ مبین احمد کے ساتھ بھی مصروف تھا اور ان کے ماربل کے چھوٹے سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ لڑکی کو خبط ہے پڑھنے کا۔ گھنٹوں کتابوں میں سر دیے بیٹھی رہتی ہے کتنے دنوں سے میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ دادی! جائیں حاذق بھائی سے مجھے پڑھانے کی بات کر کے آئیں۔" مسز شیخ بظاہر پوتی کی شکایت کر رہی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت اور فخر تھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ مریم کو خود اپنی پڑھائی کی اتنی فکر ہے ورنہ ایسے بھی بچے ہوتے ہیں کہ ماں باپ کہہ کہہ کر ہلکان ہو جائیں لیکن پڑھ کر ہی نہیں دیتے۔" مسز شیخ کی بات سن کر مسرت بیگم نے انہیں تسلی دینے کے انداز میں تبصرہ کیا۔

"خیر اس بات پر تو میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ میرے گھر کے سارے ہی بچے اس معاملے میں بڑے ذمے دار ہیں ورنہ آج کی نسل تو ایسی دیدہ ہوائی ہے کہ کیا کہوں۔" مسز شیخ کے لہجے میں فخر تھا۔

"اب دیکھو آج کل اتنی عجیب بات دیکھنے میں آ رہی ہے۔ صبح جب میں مریم کو کالج ڈراپ میں بٹھانے اس کے ساتھ گیٹ تک آتی ہوں تو کارنر پر ایک بڑی ماڈرن سی لڑکی گاڑی لیے کھڑی ہوتی ہے۔ جانے کون ہے؟ کس لیے آتی ہے؟ حاذق! تم نے تو دیکھا ہو گا اسے؟" اپنی بات کرتے کرتے مسز شیخ نے اچانک ہی حاذق سے سوال کیا تھا۔

"جی نہیں۔ میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ اصل میں صبح کے وقت اتنی جلدی ہوتی ہے کہ ارد گرد نظر ڈالنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔" حاذق، مسز شیخ کے اس اچانک سوال پر کچھ گھبرا گیا تھا۔ چنانچہ اپنی بے تعلقی ظاہر کرنے کے لیے غلط بیانی کر گیا۔

"ارے بھئی، صحیح کہتے ہیں کہ یہ پروفیسر وغیرہ بڑے غائب دماغ ہوتے ہیں۔ بھلا بتاؤ ان صاحب کو اتنی بڑی گاڑی اور لڑکی آج تک نظر ہی نہیں آئی۔ حالانکہ مریم تو یہاں تک کہہ رہی تھی کہ دادی لگتا ہے یہ لڑکی حاذق بھائی کے انتظار میں یہاں آ کر کھڑی ہوتی ہے کیونکہ حاذق بھائی کے گاڑی لے کر نکلتے ہی پیچھے ہی لڑکی کی گاڑی بھی نکل جاتی ہے، اور تمہیں سرے سے کوئی خبر ہی نہیں۔"

مسز شیخ کا برسوں سے ان کے گھر آنا جانا تھا، حاذق کی دادی کی زندگی میں تو وہ بہت ہی زیادہ آتی تھیں اس وقت بھی وہ اپنے پرانے مراسم کی بے تکلفی کے باعث آرام سے سب کچھ کہہ گئی تھیں۔

"میرے خیال میں مریم کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔ ابھی بہرحال وہ زمانہ نہیں آیا کہ لڑکیاں مردوں کا پیچھا کرتی پھریں۔"

مسز شیخ اپنی جن معلومات کا اظہار کر رہی تھیں، ان کا اپنی ماں کے سامنے بیان کیا جانا حاذق کو کھسیاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا پھر اس کے بعد مزید وہاں بیٹھا بھی نہیں اور مسز شیخ سے مریم کو اگلے دن بھیج دینے کا کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس کی شرمندگی اور کھسیاہٹ شدید غصے میں تبدیل ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ کو کیا ضرورت تھی اس طرح جھگڑا کرنے کی۔ فضول میں ایک ذرا سی بات کے پیچھے اپنا یہ حال کروا لیا۔" اسد کے ماتھے پر لگے میڈیکل ٹیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دانیہ نے خفگی کا اظہار کیا۔ پارکنگ میں مول لے جانے والے جھگڑے نے اسے اور اس کے مدِمقابل دونوں کو ہی اس طرح کے چھوٹے موٹے زخم لگائے تھے۔

"آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اس کی بات مان لیتے۔ کم از کم اس طرح جھگڑے کی نوبت تو نہیں آتی۔"

"جب میری غلطی ہی نہیں تھی تو میں کیوں اس کی بات مان لیتا؟" اسد نے دانیہ کی بات کے جواب میں ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔

"میں نے تو جس سے بھی اس واقعہ کے بارے میں سنا، اس نے آپ کو ہی بلیم کیا۔ مجھے تو کافی شرمندگی سی فیل ہو رہی۔" دانیہ نے گویا اسد کی بات ماننے سے انکار کیا۔

"اب تم میرے بجائے لوگوں کی بات کا یقین کرتے ہوئے مجھے غلط کہو گی؟" اسد خفا ہوا۔

"بات آپ کو صحیح یا غلط سمجھنے کی نہیں ہے۔ مجھے تو آپ کے ری ایکشن نے شاک لگایا ہے۔ آپ تو کبھی اسکول کے زمانے میں بھی لڑائی جھگڑا کرنے والے لڑکوں میں سے نہیں رہے پھر آج اچانک آپ کو کیا ہو گیا تھا کہ آپ نے بات کو اس حد تک بڑھنے دیا؟" دانیہ کو واقعی اسد کے عمل پر حیرت ہوئی تھی۔

"پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔ بس یہ سمجھ لو کہ وہ سامنے آیا تو میں اپنے ہوش میں ہی نہیں رہا۔ میرا دل چاہا کہ میں مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دوں۔" بالآخر اسد نے بے بس سے انداز میں وہ اعتراف کر ہی لیا جس کا دانیہ کو پہلے ہی خدشہ تھا۔

"آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ یہ سب کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔" دانیہ آہستگی سے بولی۔

"مجھے معلوم ہے مگر میں کیا کروں؟ جب بھی یہ خیال آتا ہے کہ یہ شخص ثانیہ کا منگیتر ہے اور اس کی وجہ سے میں ثانیہ کو نہیں پا سکتا، میرے دل میں اس کے لیے شدید ترین نفرت کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ میرا بس نہیں چلتا کہ میں اس کی جان لے لوں۔"

اب اسد کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا اور اس کی یہ باتیں دانیہ کو خوف میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اس نے اسد شیرازی کو بہت کم کسی بات پر ضد کرتے دیکھا تھا لیکن جب وہ کسی بات پر اڑ جاتا تھا تو پیچھے نہیں ہٹتا تھا اس کی حالیہ مثال اس کی امریکہ سے واپسی تھی۔ حسن شیرازی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اسے امریکہ میں رکے رہنے پر مجبور نہیں کر سکے تھے اور وہ اپنے اچھے بھلے کیریر کو داؤ پر لگا کر پاکستان واپس آ گیا تھا۔ اب جو اس پر نیا جنون سوار ہوا تھا، وہ نجانے کیا رنگ دکھانے والا تھا؟

☆ ☆ ☆

آج بھی حاذق نے اس سلور گرے کلنسی کو اس کی مخصوص جگہ پر دیکھا تو بے ساختہ گیٹ پر اپنی پوتی مریم کے ساتھ کھڑی مسز شیخ سے نظر چرا گیا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ یوں نظر چرا لینے سے یہ معاملہ ختم نہیں ہو گا۔

ابھی مسز شیخ نے کہا تھا، کل سارا محلہ متوجہ ہو جاتا تو وہ کیا کرتا۔ یہ مفت کی بدنامی تو اس کے صاف ستھرے کردار کا تصور خوامخواہ ہی بگاڑ ڈالتی اور یہ بات بہرحال اس کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی، چنانچہ اس نے اس مسئلے کے فوری سدِباب کے بارے میں سوچا اور مین روڈ پر پہنچنے سے قبل ہی اپنی گاڑی کو اس انداز میں روکا کہ پیچھے آتی سلور گرے کلنسی کو لا محالہ رکنا پڑا۔ حاذق اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سلور گرے کلنسی تک پہنچا۔ کلنسی کی ڈرائیور اس کے اس ردِعمل پر پریشان سی نظر آ رہی تھی۔

"تم اس طرح سے کیوں میرے پیچھے پڑی ہو اور ان چھچھوری حرکتوں کے پیچھے تمہارا کیا مقصد ہے نہ میں جانتا ہوں اور نہ ہی مجھے جاننے میں کوئی دلچسپی ہے لیکن ایک بات مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمہاری ان حرکتوں کے باعث اپنے لیے پھیلنے والی بدنامی ہرگز بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے بہت صاف لفظوں میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ آئندہ تم مجھے میرے کسی راستے میں کھڑی نظر نہ آؤ۔ اگر ایسا ہوا تو ہر طرح کے نتائج کی ذمے داری خود تم پر ہو گی۔" بہت دو ٹوک انداز میں اپنی بات کہہ کر وہ جس رفتار سے آیا تھا، اسی رفتار سے چلتا واپس اپنی گاڑی تک پہنچا اور پھر لمحہ بھر میں زن سے وہاں سے نکل گیا۔

وہ ہکا بکا سی بیٹھی اس کی گاڑی کے پیچھے اڑتی دھول کو دیکھتی رہ گئی۔ اپنی سانسوں کے سلسلے کو بحال رکھنے کے لیے اس نے جو راہ نکالی تھی۔ آج حاذق احمد نے اسے بھی بند کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے میمونہ! آج کچھ ابھی ابھی ہی لگ رہی ہو۔ کوئی پریشانی ہے کیا؟" پالک کے پتے چنتے ہوئے مسرت بیگم نے اپنے ساتھ ہی مصروفِ عمل میمونہ کا کچھ غائب دماغ سا ہونا محسوس کر کے ان سے پوچھا۔

"پریشانی کی کیا بات کہتی ہیں بھائی! ہمارے دِلوں کو تو مانو روگ ہی لگ گیا ہے۔ ثانیہ کی شکل دیکھو تو دل میں ہوک سی اٹھنے لگتی ہے۔" میمونہ نے بے حد اداسی سے جواب دیا تو مسرت بیگم آنکھوں میں در آنے والی نمی کو چھپانے کے لیے سر جھکا گئیں۔

"رات بڑی باجی کا فون آیا تھا۔ ثانیہ کے لیے اپنے دیور کے بیٹے کا کہہ رہی تھیں۔ میں جواب میں انہیں کچھ کہہ ہی نہیں سکی۔ معلوم ہے کہ ثانیہ اس بات کو سن کر ہتھے سے اکھڑ جائے گی۔ ابھی تو اللہ اللہ کر کے ذرا سنبھلی ہے اس لیے اسے چھیڑتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ مگر دوسرا ڈر یہ ہے کہ اس طرح اتنے اچھے رشتے لوٹاتے رہے تو کل کو سرے سے رشتے آنا ہی نہ بند ہو جائیں۔ لڑکیوں کی یہی تو عمر ہوتی ہے جب ان کے لیے رشتے آتے ہیں۔" میمونہ اس وقت صرف ثانیہ کی ماں تھیں' جو یہ غور کیے بغیر کہ ان کی باتیں مسرت بیگم کو تکلیف پہنچا رہی ہوں گی' اپنا ہی دکھڑا رونے میں مصروف تھیں۔

"اس طرح مت سوچو میمونہ! ابھی ثانیہ کی عمر ہی کیا ہے۔ دو چار سال گزر بھی گئے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اِن شاء اللہ اسے بہت اچھا بر ملے گا۔ ابھی تم اسے سکون سے پڑھنے دو۔ تھوڑا وقت گزرے گا تو وہ سنبھل جائے گی۔ اس لیے میرا تو یہی مشورہ ہے کہ فی الحال اس معاملے کو مت چھیڑو' وقت آنے پر اللہ اس کے نصیب کھول دے گا۔" مسرت بیگم میمونہ کی کیفیت سمجھتی تھیں' اس لیے برا مانے بغیر رسان سے انہیں سمجھانے لگیں۔

"نصیب کا ہی تو نہیں پتا چلتا کہ کیا لکھا ہے' ورنہ میں تو بڑی مطمئن تھی کہ میری بیٹی آپ کی بہو بنے گی۔ اس کی منگنی کرتے ہوئے شک تک نہیں گزرا تھا کہ نصیب ایسا پلٹا کھائے گا کہ دل کا سارا چین ہی لٹ جائے گا۔" اس بار میمونہ کی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی جسے انہوں نے اپنے دوپٹے کے پلو سے بڑی بے دردی سے صاف کیا۔

"اللہ پر بھروسا رکھو میمونہ! مجھے یقین ہے کہ میری ثانیہ کا نصیب بہت اچھا ہو گا۔ میں اس کے لیے اپنے ربّ سے بہت دعائیں کرتی ہوں۔" مسرت بیگم کے اس خلوص نے میمونہ کو شرمندہ کر دیا' وہ جو ایک ہلکا سا ایک شکوہ ان کے دل میں تھا' وہ ماند پڑنے لگا۔

"شکریہ بھائی! آپ کی اس محبت اور خلوص سے دل کو بڑی ڈھارس ملتی ہے۔" وہ شرم سار سی مسرت بیگم سے فقط اتنا ہی کہہ سکیں۔

"شکریہ کی کیا بات ہے؟ میرے لیے اپنی اولاد اور ثانیہ برابر ہیں پھر ہمارے درمیان تو شروع سے ہی ایسا تعلق رہا ہے کہ کبھی بچوں میں کوئی تفریق محسوس ہی نہیں ہوئی۔ اگر ایسا ہوتا تو میں متین صاحب کے انتقال کے بعد مبین کی محنت سے چلنے والے کاروبار کی آمدنی اپنی اولاد پر خرچ ہونے سے شرمندہ ہوتی۔ جب متین صاحب کا انتقال ہوا' اس وقت تو حاذق کو ملازمت بھی نہیں ملی تھی اور بعد میں بھی کون سا اس کی آمدنی پر گھر چل رہا ہے۔ اصل اخراجات تو ابھی بھی کاروبار کی آمدنی ہی سے پورے ہوتے ہیں۔" میمونہ کو ٹوکتے ہوئے مسرت بیگم نے بہت صاف گوئی سے مبین احمد کی خدمات کا اعتراف کیا۔

"خیر' روپے پیسے کے معاملات کو تو جانے ہی دیں۔ مبین نے جو کچھ کیا' وہ متین بھائی صاحب کے بعد اپنی ذمے داری سمجھ کر کیا اور پھر انہیں بہت کم عرصہ ہی اکیلے ساری ذمے داری سنبھالنی پڑی۔ اب بھی حاذق کی وجہ سے انہیں بہت سہارا ہے۔"

دل کی میمونہ بھی تنگ نہیں تھیں اس لیے جوابی اعتراف میں دیر نہیں لگائی۔ اتنے طویل عرصے سے مشترکہ خاندان کی حیثیت میں ان لوگوں کا رہنا اسی کشادہ دلی اور اعلا ظرفی کے باعث ہی ممکن بھی ہوا تھا اور دلوں کا یہ میل ہی تھا جو انہوں نے اپنے بچوں کو آپس میں منسوب کرنے کا فیصلہ بھی کیا تھا مگر اس مقام پر وہ قسمت سے ہار گئے تھے' قسمت نے اپنا فیصلہ سنا کر ان کے فیصلے کو یکسر کالعدم کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ثانیہ! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" اسد بہت دِنوں سے موقع کی تلاش میں تھا کہ اسے ثانیہ تنہا مل جائے تو وہ اس سے بات کرے۔ لیکن اتنے دِنوں سے اسے موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

"ضروری بات..... مجھ سے؟" ثانیہ' اسد کے خود کو اتنی بے تکلفی سے مخاطب کرنے پر کافی حیرت زدہ نظر آ رہی تھی۔

"ہاں تم سے۔ اگر تمہارے پاس تھوڑا سا وقت ہے تو میرے ساتھ کیفے ٹیریا تک چلو۔" وہ دونوں اس وقت لائبریری میں تھے' اس لیے گفتگو بہت دھیمی آواز میں ہو

رہی تھی۔

"آپ کو جو کچھ کہنا ہے' یہیں کہہ دیں۔ میں یہاں کسی کا ویٹ کر رہی ہوں۔" ثانیہ نے ناگواری سے اسد کی بات کا جواب دیا تو وہ اندر تک جھلس کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ثانیہ وہاں کس کے انتظار میں رکی ہوئی ہے۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی تو اس نے اپنے اس رقیب کو ثانیہ کے پاس سے اٹھ کر جاتے دیکھا تھا اور تب وہ اس کی ٹیبل تک آیا تھا۔

"بات جتنی اہم ہے' اس کے لیے یہ جگہ اور موقع کچھ مناسب تو نہیں ہے لیکن مجھے اندازہ ہے کہ تم مجھے اور کوئی موقع دو گی بھی نہیں' اس لیے کسی لمبی چوڑی تمہید میں پڑے بغیر تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں اور تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

اسد یک دم ہی اپنی بات کہہ گیا تھا اور ثانیہ ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔ اسد شیرازی اس کے لیے بالکل اجنبی نہیں تھا۔ وہ ثانیہ سے ملنے اکثر ان کے ڈپارٹمنٹ آتا رہتا تھا۔ اس کی شاندار شخصیت کے باعث ثانیہ نے کئی لڑکیوں کو اس کے لیے آہیں بھرتے دیکھا تھا۔ خود اس کے اپنے گروپ کی لڑکیاں بھی مذاق مذاق میں ہی سہی اسد شیرازی کی پرسنالٹی کی تعریف کیا کرتی تھیں۔ پھر اس روز پارکنگ میں ہونے والے جھگڑے کے بعد تو وہ اسد شیرازی کو اور بھی خصوصیت سے پہچاننے لگی تھی۔ جب ہی تو حیران تھی کہ وہ اس سے کیوں بات کرنا چاہتا ہے۔ مگر آنکھوں کی حیرت کے غصے کی سرخی میں بدل جانے کے باوجود بھی اس نے کمالِ ضبط سے کام لیا اور سخت مگر دھیمی آواز میں بولی۔

"سوری اسد صاحب! میں آپ کے جذبات کی پذیرائی نہیں کر سکتی۔ میں اپنے کزن کے ساتھ منسوب ہوں اور اس سے بہت محبت کرتی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں تمہاری انگیجمنٹ کے بارے میں لیکن یہ کوئی ایسا رشتہ تو نہیں جسے توڑا نہ جا سکے۔" اسد' ثانیہ کی محبت والی بات کو قطعی نظر انداز کر گیا تھا۔

"آپ حد سے بڑھ رہے ہیں مسٹر اسد!" اس بار ثانیہ کا انداز زیادہ درشتی اور رکھائی لیے ہوا تھا اور اس نے جس طرح یک دم ہی ٹیبل پر بکھری کتابیں اور فولڈر وغیرہ سمیٹنے شروع کر دیے تھے اس سے اسد اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اس سے جان چھڑانے کے لیے لائبریری سے نکلنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

"پلیز ثانیہ! تم میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور تو کرو۔ یقین کرو' میں تمہارے لیے تمہارے فیانسی سے بہت زیادہ اچھا ثابت ہوں گا۔ میں تم سے بہت محبت کروں گا۔ میں دنیا کی ہر نعمت تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔ تمہارے فیانسی کے پاس کیا ہے۔" اسد جلدی جلدی بولتا گویا ثانیہ کو لالچ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مسٹر اسد شیرازی! یقیناً" آپ بہت دولت مند ہیں اور آپ کے باپ نے آپ کے لیے خزانوں کے ڈھیر لگا رکھے ہیں لیکن ایک بات آپ آج اچھی طرح سمجھ لیں' دنیا کی ہر چیز بکاؤ نہیں ہوتی۔ آپ چاہے اپنی ساری دولت داؤ پر لگا دیں لیکن میری محبت ہرگز نہیں خرید سکتے کیونکہ وہ صرف اور صرف میرے فیانسی کے لیے ہے۔ میں نے شعور کی عمر کو پہنچنے سے بھی بہت پہلے اس سے محبت کرنا شروع کر دی تھی اور اس محبت کی جڑیں میرے اندر اتنی گہرائی تک اتری ہوئی ہیں کہ کوئی میرے وجود کو تو ختم کر سکتا ہے لیکن میرے وجود سے اس کی محبت نہیں نکال سکتا۔"

تپے تپے تاثرات کے ساتھ وہ اپنی بات کہنے کے بعد وہاں مزید رکی نہیں تھی اور تیزی سے بیرونی راستے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اسد بھی چند ثانیے کے وقفے کے بعد اس کے پیچھے لپکا تھا مگر پھر سامنے سے آتے شخص کو دیکھ کر اسے رکنا پڑا تھا۔

"ایک تو تم میں صبر بالکل نہیں ہے ثانی! میں نے کہا تھا کہ لائبریری میں بیٹھو میں یہ نوٹس فوٹو کاپی کروا کر ابھی آتا ہوں لیکن تمہیں تو میرا اعتبار ہی نہیں ہے۔ فوراً" باہر نکل آئیں کہ پتا نہیں میں کس حسینہ کے ساتھ گپیں مارنے کھڑا ہو گیا ہوں۔ تمہاری اس شک کی عادت کی وجہ سے شادی کے بعد ہماری بڑی لڑائیاں ہوں گی۔"

وہ بظاہر ثانیہ پر غصہ کر رہا تھا لیکن اس کی آواز کی شوخی بتا رہی تھی کہ اصل مقصد ثانیہ کو چھیڑنا ہے۔

"لڑائیاں ہوں یا جنگ و جدل' یہ طے ہے کہ شادی میں تم سے ہی کروں گی اس لیے اچھا یہی ہو گا کہ تم ابھی سے میری فرماں برداری کی عادت ڈال لو۔"

ثانیہ جواباً" بہت سنجیدگی سے با آواز بلند بولی تھی۔ اسد شیرازی سمجھ سکتا تھا کہ یہ بات اس نے دراصل اپنے منگیتر سے نہیں بلکہ اسے سنانے کے لیے کہی ہے۔ وہ جھلستا ہوا کھڑا ثانیہ کی آواز کی گونج اور ردِ عمل میں اس کے منگیتر کا

لگایا جانے والا بلند قہقہہ سنتا رہا اور اس کے اندر ایک بار پھر یہ خواہش جنم لینے لگی کہ وہ اس قہقہے لگاتے شخص کو جان سے مار ڈالے کہ یہی شخص تھا جو ثانیہ کو پانے کی راہ میں اس کے لیے رکاوٹ بن گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دانیہ اور اسد نے حیرت سے حسن شیرازی کے ساتھ آنے والی اس سجی سنوری عورت کو دیکھا جو بہت حسین نہیں تھی لیکن کام دار، قیمتی اسٹائلش ساڑھی، بھاری زیورات اور کسی اچھے بیوٹی پارلر سے کروائے گئے میک اَپ کے ساتھ حسین نظر آرہی تھی۔ اس کی عمر تیس بتیس سال تک تصور کی جاسکتی تھی۔ ممکن ہے اصل عمر اس سے زیادہ ہو لیکن جس قسم کی تیاری اس نے کر رکھی تھی۔ اس کے ساتھ اصل عمر کا اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔ پھر اس کی اسمارٹنس بھی غضب کی تھی۔

ان کی حیرت کا سبب اس عورت کی حسن شیرازی کے ساتھ نظر آنے والی بے تکلفی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیے بے حد خوشگوار موڈ میں اندر آئے تھے۔ اسد اور دانیہ کو دیکھ کر بھی ان کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ حسن شیرازی تو ان دونوں کو وہاں بیٹھا دیکھ کر باقاعدہ مسکرائے تھے اور پھر اپنے ساتھ آنے والی عورت کے ساتھ ایک صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے بولے تھے۔

"اچھا ہوا۔ تم دونوں یہیں مل گئے۔ مجھے تم لوگوں کا انٹروڈکشن کروانے میں آسانی رہے گی۔"

دانیہ اور اسد نے ان کے لہجے کی خوشگواری کو محسوس کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ حسن شیرازی یوں بھی اپنی اولاد کے ساتھ بے تکلفی اور بے فکری سے گفتگو کرنے والے آدمی نہیں تھے اور جب سے دانیہ اور اسد نے اپنے مستقبل کے فیصلے ان کی مرضی کے برخلاف کیے تھے تب سے تو ان کے انداز میں اچھی خاصی سرد مہری آگئی تھی لیکن آج تو وہ کوئی بالکل بدلے ہوئے آدمی لگ رہے تھے۔

"جیا! ان دونوں کے بارے میں تو میں نے تمہیں بتا ہی رکھا ہے۔ دانیہ اور اسد میرے بچے۔" حسن شیرازی کے انداز نے دانیہ اور اسد کو سخت تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔

"یہ جیا ہے۔ میری مسز۔ ہم لوگوں نے آج ہی چند خاص دوستوں کی موجودگی میں شادی کی ہے۔ آج سے یہ یہیں ہمارے ساتھ اس گھر میں رہے گی۔" آخر حسن شیرازی نے دھماکہ کر ہی دیا۔ دانیہ اور اسد ان کی بات سن کر بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔ حسن شیرازی کے چھوٹے موٹے افیئرز کی خبریں تو انہیں ملتی ہی رہتی تھیں۔ سونیا شیرازی کی زندگی میں بھی وہ اکثر کسی نہ کسی اسکینڈل کی زد میں رہتے تھے لیکن وہ اس طرح کسی عورت کو بیوی کی حیثیت سے گھر لے آئیں گے یہ ان لوگوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں پاپا!" آخر اسد نے ہی احتجاجی انداز میں لب کھولے۔

"کیا کہہ رہا ہوں کا کیا مطلب ہے؟ میں نے بہت صاف لفظوں میں تمہیں بتایا ہے کہ میں نے جیا سے شادی کرلی ہے اور میرے خیال میں یہ کوئی اتنی حیرت کی بات نہیں۔ مجھے سونیا کے بعد ایک ساتھی کی ضرورت تھی جو میرے ساتھ سرکل میں موو کر سکے اور بزنس میں میری ہیلپ کر سکے۔ جیا بہت ٹیلنٹڈ ہے۔ پچھلے دو سال سے میری پرسنل سیکریٹری کی حیثیت سے اس نے جس طرح میرے ساتھ کام کیا ہے، مجھے یقین ہے کہ یہ بیوی کی حیثیت سے بھی میرے لیے بہت بہترین ساتھی ثابت ہو گی۔"

حسن شیرازی اپنے فیصلے سے بے حد مطمئن نظر آتے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھی جیا نامی وہ عورت بھی چہرے پر بڑی پرسکون سی مسکراہٹ سجائے ہوئے تھی لیکن اسد اور دانیہ کا تو سارا سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔ وہ اچانک اپنی ماں کی جگہ گھر میں آجانے والی اس عورت کو قبول نہیں کر پا رہے تھے۔

"آپ کو کم از کم اس فیصلے سے پہلے ہماری رائے تو لینی چاہیے تھی۔" اسد نے دبے دبے غصے کے ساتھ اعتراف کیا۔

"تم لوگ میری اولاد ہوتے ہوئے اپنے فیصلوں میں میری رائے کو امپورٹنس دینا ضروری نہیں سمجھتے تو مجھ سے کیسے امید رکھ سکتے ہو کہ میں تم سے کسی قسم کا کوئی مشورہ لوں گا؟"

اس بار حسن شیرازی نے بے حد سرد اور روکھے لہجے میں جواب دیا تھا۔ ان کا جواب ایسا تھا کہ اسد کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی لیکن اس کے اندر ابھرتا غصہ

ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کرتا۔ اس کا اور کچھ بس نہ چلا تو وہاں موجود ایک چھوٹی ٹیبل کو پاؤں سے ٹھوکر مارتا ہوا تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ اس سارے قصے کے دوران خاموش تماشائی بنی کھڑی دانیہ اسے باہر نکلتے دیکھ کر تیزی سے اس کے پیچھے لپکی۔

حسن شیرازی نے اپنے بیٹے اور بیٹی کے اس ردِعمل کو بے حد بے نیازی سے دیکھا اور شانے اچکاتے ہوئے جیا کا ہاتھ تھام کر اس کے ساتھ اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے۔

☆ ☆ ☆

جیا نے بہت تیزی سے گھر میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا شروع کر دیا تھا۔ ملازمین بھی اس کے حکم کی تعمیل بہت جاں فشانی سے کرتے تھے۔ کیوں نہ کرتے؟ انہوں نے ہواؤں کا رخ پہچان لیا تھا۔ حسن شیرازی اپنی نئی نویلی بیوی پر جس طرح فریفتہ نظر آتے تھے اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس کی اس گھر میں کیا حیثیت ہے۔ دانیہ اور اسد یک دم پس منظر میں چلے گئے تھے اور ہر طرف جیا ہی جیا نظر آتی تھی۔ گھر کے ساتھ ساتھ اس کا آفس میں بھی عمل دخل تھا۔ وہ صبح حسن شیرازی کے ساتھ ہی آفس کے لیے نکلتی تھی البتہ اس کی واپسی ان سے پہلے ہو جاتی تھی۔ رات میں کسی بزنس پارٹی یا ڈنر پر جانا ہوتا تو تیار ہو کر حسن شیرازی کے ساتھ چلی جاتی۔

وہ حسن شیرازی کی ذات، گھر اور بزنس پر اس طرح چھا گئی تھی کہ سونیا کا نام و نشان بھی محسوس نہیں ہوتا تھا اور یہ بات دانیہ اور اسد کو تکلیف دیتی تھی۔ اپنی ماں کی جگہ اس دوسری عورت کو برداشت کرنا بہت مشکل لگتا تھا۔

خاص طور پر اسد جو پہلے ہی ثانیہ والے معاملے کی وجہ سے ذہنی دباؤ کا شکار تھا، اب اور بھی چڑچڑا ہو گیا تھا لیکن اپنا یہ غصہ اور چڑچڑاہٹ جیا پر نکالنے کے لیے اسے کوئی جواز نہیں مل پاتا تھا کہ جیا کبھی بھی ان دونوں بہن بھائی سے براہ راست کسی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آنے دیتی تھی۔

حسن شیرازی پہلے بھی انہیں وقت اور توجہ نہیں دیتے تھے اس لیے اب بھی جیا کو موردِ الزام ٹھہرانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن جیا کے آنے کے بعد گھر کے درو دیوار سے وہ اپنے لیے جو اجنبیت سی برستی محسوس کرتے تھے اس کا کوئی حل نہیں تھا۔ ان ہی بے کیف اور تناؤ زدہ دنوں میں اسد کو ایک نئی بات سوجھ گئی۔

"ثانیہ کے گھر میرا پرپوزل لے کر جائیں۔" یہ اس کا حسن شیرازی سے مطالبہ تھا۔ جس پر انہیں کئی اعتراضات تھے۔ اوّل یہ کہ وہ پہلے اپنا کیریر بنائے اور کسی لائق ہو تو شادی کی بات کرے۔ دوم انہیں ثانیہ کے بیک گراؤنڈ پر اعتراض تھا۔ بھلا ایک اپر مڈل کلاس کی لڑکی کو بہو بنا کر حسن شیرازی جیسے خالص کاروباری دماغ والے آدمی کو کیا حاصل ہونا تھا چنانچہ وہ یہ گھاٹے کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بالآخر اسد نے دھمکی دی کہ وہ بزنس میں موجود اپنے ماں کے شیئرز جو سونیا کی وصیت کے مطابق اسد کے ہی نام تھے، نکال لے گا۔

اس کی دھمکی کے بعد جیا نے حسن شیرازی کو سمجھایا تو وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ جیا خود جا کر ثانیہ کے گھر والوں سے رشتے کی بات کرلے۔ اسد بھی اس تجویز پر راضی ہو گیا لیکن ثانیہ کے گھر والوں کا جواب اس کے لیے مایوس کن تھا۔ انہوں نے جیا کے قیمتی لباس گاڑی اور موبائل کے ساتھ ساتھ حسن شیرازی کی مالی حیثیت اور اسد کی شان دار شخصیت سمیت کسی بھی شے سے مرعوب ہوئے بغیر بڑی سہولت سے اس پرپوزل کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ ثانیہ اپنے تایا زاد سے منسوب ہے اور تعلیم مکمل ہونے کے بعد ان دونوں کی شادی ہو جائے گی چنانچہ اسد شیرازی کے پرپوزل پر قطعی غور کرنے کی گنجائش نہیں۔

دانیہ کو اس جواب کا پہلے ہی اندازہ تھا لیکن اس نے جیا کے رشتہ لے کر جانے سے پہلے کوئی اعتراض اس لیے نہیں کیا تھا کہ اسد اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے ایک کوشش کر کے دیکھ لے۔ پھر بھی ثانیہ کے گھر والوں کے انکار پر اسد کی مایوسی دیکھ کر وہ بہت افسردہ ہوئی تھی البتہ جیا اور حسن شیرازی بہت مطمئن دکھائی دیتے تھے۔ ان کی طرف سے پرپوزل چلے جانے کے بعد اسد کے پاس اب ان سے جھگڑا مول لینے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا اور ثانیہ کے گھر والوں کے انکار کے بعد وہ اپنی خواہش کے خلاف اسد کی شادی کرنے سے بھی بچ گئے تھے۔ اسد نے کوئی بھی ردِعمل ظاہر کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کرلی تھی مگر اس کی خاموشی ایسی تھی کہ ہر ایک محسوس کرتا تھا کہ اس کے اندر غم و غصے کا طوفان موجیں مار رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

یونیورسٹی کی فضا یکدم بدل سی گئی تھی۔ معمول کے

لیکچرز اور پڑھائیوں سے یکسانیت کا شکار طلبہ و طالبات بڑے جوش و خروش سے یونیورسٹی میں منائے جانے والے ہفتہ طلباء میں حصہ لے رہے تھے۔ مختلف پروگرامز میں حصہ لینے والوں کا تو عالم ہی الگ تھا لیکن وہ جو صرف تماشائیوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے جوش و خروش میں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہر طرف گویا بہار کا عالم تھا۔ اسد شیرازی جو آج کل شدید پژمردگی کا شکار تھا اس سارے ہنگامے میں دلچسپی نہ رکھنے کے باوجود روزانہ یونیورسٹی آرہا تھا کہ یونیورسٹی نہ آنے کی صورت میں گھر میں بھی نہیں رکا جا سکتا تھا۔

گھر میں رکنے کی صورت میں اسے جیا نام کی اس عورت کو مالکانہ حقوق کے ساتھ وہاں چلتے پھرتے دیکھنا پڑتا تھا جسے وہ کبھی بھی اپنی ماں کی جگہ پر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر یونیورسٹی آنے میں ایک کشش یہ بھی تھی کہ وہ دور سے ہی سہی ثانیہ کو دیکھ لیا کرتا تھا۔

اس دیکھنے کے عمل میں نارسائی کی تکلیف اگرچہ بڑھ جاتی تھی لیکن پھر بھی دل اپنی دسترس میں موجود اس اکلوتی خواہش سے دست بردار ہونے کو راضی نہیں ہوتا تھا۔ ہفتہ طلباء کے سارے پروگراموں کے دوران بھی اسد کی یہ کوشش رہی تھی کہ وہ ہر اس مقام پر موجود رہے جہاں ثانیہ اپنے گروپ کے ساتھ موجود ہو۔ پروگرام کا آخری دن اس کے لیے خصوصی دلچسپی کا باعث تھا۔ اس دن "روبرو" کے نام سے ایک خصوصی پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔

اس پروگرام میں سیاست، شوبز اور تعلیم اور کھیل کے شعبوں سے وابستہ چند اہم شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان شخصیات کو طلبہ کے روبرو ان کے کاٹ دار اور کھوج لگاتے سوالوں کا جواب دینا تھا۔ ان اہم شخصیات سے سوال و جواب کے لیے جن منتخب طلباء و طالبات کا پینل ترتیب دیا گیا تھا ان میں ثانیہ بھی شامل تھی۔ سفید رنگ کا کلف دار شلوار قمیص، جس پر ہلکے رنگ کے دھاگوں سے کڑھائی کی گئی تھی اس پر بہت جچ رہا تھا۔ اسد شیرازی کی نظریں سفید دوپٹے کے ہالے میں دمکتے اس کے پُرنور چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

ثانیہ احمد کی شوخ، کھنکتی ہوئی آواز اور مدھر ہنسی اور اپنی یہ دیوانگی اسے بتا رہی تھی کہ زندگی ثانیہ احمد کے بغیر بہت مشکل ہوگی۔ یہ اس دیوانگی کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ پروگرام کے اختتام پر ثانیہ احمد کو کھوجتا اسٹیج کی پچھلی جانب جا پہنچا تھا۔ ثانیہ اسے اپنے عین سامنے پا کر حیران ہوئی تھی اور پھر کترا کر وہاں سے ہٹ جانا چاہا تھا لیکن اسد شیرازی پر آج جو دیوانگی طاری تھی، وہ ثانیہ کی راہ کی رکاوٹ بن گئی۔

"پلیز ثانیہ! میری بات سنو۔" وہ ملتجی سے لہجے میں اس سے بولا تھا۔

"میرے خیال میں ہمارے درمیان کسی بات کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ آپ کے ہر سوال کا جواب میں اور میرے گھر والے آپ کو بے حد واضح طور پر دے چکے ہیں۔" ثانیہ نے نہایت رکھائی سے اسے جواب دیا تھا۔

"میں اس جواب کو نہیں مانتا۔ میں مان ہی نہیں سکتا کیونکہ تم نہ ملیں تو میں جی نہیں سکوں گا۔" "اسد یہ پروا کیے بغیر کہ اردگرد اور بھی لوگ موجود ہیں ثانیہ کو حال دل سنا رہا تھا اور وہ شدید سبکی محسوس کر رہی تھی، چنانچہ بے حد بے رخی اور سختی سے بولی۔

"آئی ڈونٹ کیئر، میری طرف سے آپ جہنم میں جائیں مجھے کوئی پروا نہیں۔"

"پلیز ثانیہ! پلیز۔ میری بات مان لو۔ میں دنیا کی ہر نعمت تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔" ثانیہ کی بے رخی کو خاطر میں لائے بغیر اسد اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آپ تو اپنے لیے کچھ حاصل نہیں کر سکتے، مجھے کیا دے سکیں گے۔"

ثانیہ نے استہزاء سے کہتے ہوئے ایک بار پھر وہاں سے جانے کی کوشش کی۔ آس پاس اگرچہ چند ہی طلبا و طالبات موجود تھے پھر بھی وہ سخت خفت محسوس کر رہی تھی مگر اسد نے بھی گویا تہیہ کر رکھا تھا کہ آج ثانیہ احمد کا پیچھا نہیں چھوڑنا ہے۔ ثانیہ کے قدم بڑھاتے ہی اس نے لپک کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہی وہ وقت تھا جب غصے سے تمتماتا چہرہ لیے وہ وہاں پہنچا۔ اسے شاید اس کے کسی دوست نے اس صورتِ حال کی خبر پہنچائی تھی۔ ثانیہ کا ہاتھ اسد کے ہاتھ میں دیکھ کر اس کا غصہ سوا نیزے پر جا پہنچا اور اس نے براہِ راست اسد کے گریبان کو پکڑ کر اسے جھٹکا دیا۔

اسد جس کیفیت میں تھا اس میں اس شخص کی موجودگی قطعی ناقابلِ قبول تھی۔ کئی دنوں سے سینے میں پلتا جذبہ رقابت اس وقت خون بن کر اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح گتھم گتھا ہوئے کہ ثانیہ کی چیخیں اور اردگرد موجود طلباء کی

دخل اندازی بھی کام نہیں آسکی۔ جوانی کا جوش دونوں طرف برابر تھا لیکن اسد کو اپنے قد و قامت اور جم خانے میں باقاعدگی سے کی جانے والی ورزشوں کے باعث اپنے مقابل پر فوقیت حاصل تھی پھر اس پر غصے سے بھی بڑھ کر جنون سوار تھا۔ اس اندھے جنون نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں یکدم مفقود کر دیں اور دل ہی دل میں پلتا اپنے رقیب کو جان سے مار دینے کا خیال پوری قوت سے حاوی ہو گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ مقابل کے سر کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر پوری قوت سے اس کا سر زمین سے ٹکرانے لگا۔ اس بے چارے کی قسمت بھی اس وقت اس کے مخالف تھی کہ اسد نے تیسری بار جو اس کا سر زمین پر مارا تو وہ زمین پر پڑنے کے بجائے ٹینٹ لگانے کے لیے زمین میں گاڑی گئی کیل پر جا لگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سر کی پچھلی جانب سے خون کا فوارہ سا ابل پڑا۔ اردگرد موجود طلباء میں ہنگامہ سا مچ گیا۔ ان میں سے دو زخمی کو سنبھالنے کے لیے آگے بڑھے اور دو تین نے پوری قوت سے اسد کو جکڑ کر مزید حملہ کرنے سے روکا۔ اسد بھی اپنے مقابل کے سر سے تیزی سے بہتے خون کو دیکھ کر ہوش میں آچکا تھا، اس لیے اس بار کوئی خاص مزاحمت نہ کر سکا۔

☆ ☆ ☆

حاذق احمد نے گھر میں موجود لوگوں کے ہجوم پر ایک نظر ڈالی۔ وہ سارے ہی چہرے جوان موت پر رنجیدہ تھے مگر ان چہروں میں کچھ چہرے ایسے تھے جن پر زندگی کی رمق بھی محسوس کرنا مشکل تھا۔ غم کی شدت سے ڈھلک جانے والے شانوں کے ساتھ افسوس کرتے لوگوں سے گلے ملتے بین احمد، ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی لٹی پٹی سی نظر آتی مسرت بیگم جن میں شدتِ غم سے آنسو بہانے کا یارا بھی نہیں رہا تھا۔

بار بار بلند آواز سے رو پڑتی میمونہ اور عورتوں کے گھیرے میں بے ہوش پڑی ثانیہ، جس کے سفید آنچل پر حاذق احمد کا خون سوکھ کر سیاہی مائل رنگ اختیار کر چکا تھا۔ عورتیں کوشش کر کے اس کو بار بار ہوش میں لاتی تھیں اور وہ غم کی تاب نہ لا کر پھر بے ہوش ہو جاتی تھی۔

حاذق کا دل چاہا کہ ان عورتوں کو ثانیہ کو ہوش میں لانے سے روک دے کہ یہ بے ہوشی کم از کم اسے اپنے شارق کے جدا ہو جانے کے غم سے تو غافل رکھے ہوئی تھی لیکن خواہش کے باوجود وہ کسی سے کچھ نہیں کہہ سکا۔

جانے والا تو جا چکا تھا۔ اب کفن میں لپٹا جو جسدِ خاکی سامنے رکھا تھا وہ بھی بس اس گھر میں کچھ دیر کا مہمان اپنی آخری آرام گاہ پہنچائے جانے کا منتظر تھا۔ گھر کے مکینوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے رخصت کرنا تھا۔ اس کے عزیزوں کے شانے چاہے غم کے بوجھ سے جھکے جا رہے تھے پھر بھی انہیں اس جوان لاشے کو اپنے کاندھے کا سہارا دے کر اسے اس کی آخری منزل تک پہنچانا تھا۔

آج صبح جب وہ ہنستا مسکراتا یونیورسٹی کے لیے روانہ ہوا تھا تو کون تصور کر سکتا تھا کہ وہ ایک لاش کی صورت میں واپس گھر پہنچے گا۔ یہ انتہائی گمان تو حاذق احمد کو اس وقت بھی نہیں گزرا تھا جب وہ شارق کے زخمی ہونے کی خبر سن کر بھاگم بھاگ جائے حادثہ پر پہنچا تھا۔ اس وقت تک شارق کو ایمبولینس میں ڈالا جا چکا تھا۔ حاذق اور ثانیہ اس کے ساتھ ہی ایمبولینس میں ہسپتال گئے تھے اور سچ یہ تھا کہ شارق نے ہسپتال پہنچنے سے پہلے ایمبولینس میں ہی دم توڑ دیا تھا لیکن حاذق خود کو اور ثانیہ کو یہ یقین دلاتا رہا تھا کہ وہ صرف بے ہوش ہے اور طبی امداد ملنے پر ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن ہسپتال میں ڈاکٹرز کے ایک معذرتی جملے نے ان کی ہر آس توڑ دی تھی۔ اس کے بعد کی ساری کارروائی کیسے انجام دی گئی، حاذق کو قطعی ہوش نہیں تھا۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح سارے کام کرتا رہا تھا۔ کچھ شارق کے دوستوں اور اس کے اپنے کولیگز کا ساتھ تھا جس کے باعث بہت سے مشکل مراحل طے پا گئے تھے۔

اسد شیرازی کی گرفتاری کی خبر بھی اس نے سنی تھی، لیکن ابھی وہ اس قابل نہیں تھا کہ اپنے بھائی کے قاتل کے بارے میں کچھ سوچ سکتا۔ ابھی تو وہ صرف شارق کی موت کے صدمے کے زیرِ اثر بالکل سن سا ہوا بیٹھا تھا۔ عزیز و اقارب، محلے دار اور دوست احباب ہی سب کچھ سنبھال رہے تھے۔

"حاذق بیٹا! حوصلہ کرو۔ اب تمہیں ہی سب کچھ سنبھالنا ہے۔ میرے بوڑھے وجود میں اتنا دم نہیں کہ میں سب کو سمیٹ سکوں۔ تم جوان آدمی ہو، تمہیں ہمارا سہارا بننا ہوگا۔ صبوحی سے میری فون پر بات ہوئی ہے۔ وہ بہت بے قرار ہے لیکن اس کا پہنچنا ممکن نہیں، ہمیں اس کے بغیر ہی شارق کو رخصت کرنا ہوگا۔"

وہ شارق کے بے جان چہرے پر نظریں جمائے ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا کہ آخری بار جی بھر کر اس چہرے کو دیکھ لے تب مبین احمد نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر یہ کلمات ادا کیے۔ حازق احمد اچھا خاصا سمجھ دار اور باوقار ہوتے ہوئے بھی ضبط نہ کرسکا اور مبین احمد کے شانے سے لگ کر رونے لگا۔ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے۔ اردگرد موجود لوگوں نے دونوں کو سمجھا بجھا کر اور خواتین کا احساس دلا کر خاموش کروایا تو انہوں نے غم کو سینے میں ہی دبا کر حوصلہ پکڑا۔

مگر پھر بھی وہ گھڑی قیامت کی گھڑی تھی جب شارق احمد کا جنازہ گھر کی دہلیز سے پار نکلا۔ اپنے تو اپنے غیر بھی اس کو رخصت ہوتے دیکھ کر رو پڑے۔ حازق احمد کے لیے سب سے بڑا امتحان کا مرحلہ وہ تھا جب اس نے شارق کو لحد میں اتار کر اس کے وجود کو ڈھیروں مٹی تلے چھپتے دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اس لمحے کے بعد وہ اپنے بھائی کا چہرہ کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔

☆ ☆ ☆

"یہ آپ نے کیا کیا بھائی؟" سلاخوں کے اس پار نظر آتے اسد شیرازی کے چہرے کو دیکھتے ہوئے دانیہ نے شکوہ کناں لہجے میں اس سے پوچھا۔

"پتا ہی نہیں چلا دانیہ! پتا ہی نہیں چلا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟ بس ایک آگ تھی جو شارق احمد کو اپنے مقابل پا کر میرے سینے میں بھڑکی اور میں انسان سے حیوان بن گیا۔"

اسد کی آنکھیں سوجی ہوئی اور لہجہ شرمندہ تھا۔ شارق احمد کو مارنے کی بارہا خواہش کرنے کے باوجود اسے گمان نہیں تھا کہ وہ یہ سفاکانہ عمل کر گزرے گا۔ جو کچھ ہوا، وہ اندھے غصے اور حسد کی آگ کے سبب ہوا ورنہ وہ اتنا شقی القلب انسان نہیں تھا کہ اتنی آسانی سے کسی انسان کی جان لے لیتا۔

"آپ تو اتنے سوفٹ نیچر کے ہوا کرتے تھے۔ آپ کے اندر اتنا غصہ اور جنون کہاں سے آگیا تھا؟" دانیہ بہت الجھی ہوئی تھی۔

"پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا؟ شاید ممی کی ڈیتھ، پاپا کی سیکنڈ میرج اور ثانیہ کو پانے کی راہ میں رکاوٹ، ان سب باتوں نے مل کر مجھے ایسا جنونی بنا دیا تھا۔" اسد خود بے بس سا نظر آتا تھا۔ جو کچھ گزر گزرا تھا اس کے بعد غصہ اور جنون تو ایک طرف رہ گیا تھا بس شدید احساسِ ندامت تھا جو اس کی ذات کو گھیرے ہوئے تھا۔ اب سوچتا تھا تو خیال آتا تھا کہ آخر شارق احمد کا قصور ہی کیا تھا؟ وہ ثانیہ سے اور ثانیہ اس سے محبت کرتی تھی تو اسے 'اسد شیرازی کو کیا حق پہنچتا تھا کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کرتا۔ ثانیہ احمد کوئی بازار میں کھلونوں کی دوکان پر سجا کر رکھی گئی برائے فروخت گڑیا تو نہیں تھی جسے وہ زیادہ بڑی بولی لگا کر خرید سکتا۔ اس نے ثانیہ سے محبت کا دعوا تو ضرور کیا تھا لیکن دلوں کا سودا کس انداز میں ہوتا ہے، وہ یہ بھی نہیں جان سکا تھا۔

وہ حسن شیرازی کا بیٹا تھا جو ہر شے کا مول سکہ رائج الوقت میں لگانے کے عادی تھے لہٰذا لاشعوری طور پر وہ بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی دولت کے زعم میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"پاپا آئے تھے آپ سے ملنے، کیا کہا انہوں نے؟" اسد کے چہرے پر موجود ندامت کے رنگوں کو دیکھتے ہوئے دانیہ نے موضوع بدلا۔

"ناراض ہو رہے تھے کہ میں نے ایک معمولی لڑکی کی خاطر اپنا فیوچر اور ان کی گڈول داؤ پر لگا دی۔"

اسد نے اداسی سے بتایا تو دانیہ کچھ پل کے لیے چپ ہو گئی۔ اس مقام پر وہ حسن شیرازی کو مکمل طور پر غلط بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ واقعی زیادہ تر اخباروں نے اس خبر کو ان کے نام کے ساتھ ہی شائع کیا تھا۔ معروف بزنس مین حسن شیرازی کے بیٹے کا ایک لڑکی کے عشق میں اس کے منگیتر کو قتل کرنا، اخبارات کے لیے چٹ پٹی خبروں کا ایک ذریعہ بن گیا تھا۔ حسن شیرازی کا ان خبروں پر موڈ خراب ہونا ایک لازمی امر تھا۔

"پاپا نے آپ کی ضمانت کے سلسلے میں کیا کیا؟ اپنے لائر کو تو وہ اپنے ساتھ ہی یہاں لائے تھے۔" کچھ لمحوں کے وقفے کے بعد دانیہ نے اسد سے ایک دوسرا سوال پوچھا۔

"پاپا کا لائر (وکیل) میری ضمانت نہیں کروا سکا۔ ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہی میں اپنا اسٹیٹمنٹ (بیان) دے چکا تھا۔ جس میں میں نے ایکسیپٹ (قبول) کر لیا ہے کہ میں شارق احمد سے شدید نفرت کرتا تھا اور اس نفرت کی وجہ سے میرے دل میں کئی بار اسے قتل کرنے کا خیال ابھرا تھا۔ اس دن ہونے والی لڑائی میں بھی میرے دل میں اسے قتل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی چنانچہ میں نے

اس کے سر پر ایسی ضربیں لگائیں جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئیں۔"

اسد کی بات سن کر دانیہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ اتنے صاف اعترافِ قتل کے بعد اسد شیرازی کی ضمانت کیونکر ممکن تھی۔

"آپ کو اپنا اسٹیٹمنٹ (بیان) دینے سے پہلے لائر کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ وہ آپ کو گائیڈ کرتا، اس کے بعد آپ اسٹیٹمنٹ دیتے تو اتنی پرابلم نہیں ہوتی۔"

"پاپا کا بھی یہی کہنا تھا۔ وہ سخت ناراض تھے کہ میں نے لائر کے آنے سے پہلے کوئی اسٹیٹمنٹ کیوں دیا؟ ان کا خیال تھا کہ میں اب اپنا اسٹیٹمنٹ بدل دوں مگر میں نے انکار کر دیا۔ میں ایک انسان کو قتل کر دینے کی گلٹ (پشیمانی) کے بعد کسی اور گلٹ کو اپنے اندر جگہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ مگر پاپا اس بات کو نہیں سمجھ سکے۔ ان کے لائر نے بھی مجھے مشورہ دیا کہ میں کورٹ میں جانے کے بعد اپنے بیان سے پھر جاؤں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ میں نے جو جرم کیا ہے، اس کی سزا مجھے ضرور ملے۔" اسد کی باتوں نے دانیہ کے رونگٹے کھڑے کر دیے اور بالآخر وہ بے بس سی ہو کر رونے لگی۔

"مت رو دانیہ! تمہارے رونے سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" اسد نے سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ باہر نکال کر اس کے آنسو پونچھے۔

"کیسے نہ روؤں؟ ایک آپ ہی تو ہیں جسے میں ساری دنیا میں اپنا کہہ سکتی ہوں اور اب آپ بھی میرے پاس نہیں رہے۔ اس لیے آئے تھے آپ پاپا سے اتنا لڑ جھگڑ کر امریکہ سے کہ یہاں ان سلاخوں کے پیچھے آبیٹھیں؟ کیا فائدہ ہوا اپنا کیریر داؤ پر لگا کر آپ کے یہاں آنے کا؟ میں تو کل کی طرح آج بھی تنہا ہوں۔" وہ اور بھی زیادہ شدت سے رونے لگی۔

"آئی ایم سوری مائی لٹل سسٹر! واقعی میں تمہارے کسی کام نہیں آسکا ورنہ امریکہ سے تو یہی سوچ کر واپس آیا تھا کہ اپنی بہن کو کسی رشتے کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا اور بھائی کے ساتھ ساتھ ماں باپ کے رشتے بھی خود نبھاؤں گا۔ مگر میں کچھ نہیں کر سکا۔ میں تمہیں کوئی خوشی نہیں دے سکا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔"

اسد شیرازی کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی اور اس نے دانیہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے بے حد شکستہ لہجے میں اس سے درخواست کی۔

"کچھ نہیں ہو گا آپ کو۔ میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ آپ کو میری خاطر جینا ہو گا اور ان سلاخوں سے باہر آنا ہو گا۔" دانیہ نے اپنے ہاتھوں کو تھامے اس کے ہاتھوں پر بوسہ دیتے ہوئے عزم ظاہر کیا۔

اپنی بہن کی اس محبت پر اسد کی آنکھیں بھر آئیں اور ساتھ ہی اس کے دل میں اس گھر کا خیال بھی آیا جہاں اس کی وجہ سے صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔

"ثانیہ کے بارے میں کچھ خبر ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے؟" اس نے دانیہ سے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ میری ہمت ہی نہیں ہوئی کہ کسی کلاس فیلو سے کانٹیکٹ کرتی۔"

دانیہ نے آہستگی سے بتایا تو اسد کا احساسِ ندامت اور بھی گہرا ہونے لگا۔ دانیہ حسن جو بزنس ٹائیکون حسن شیرازی کی اکلوتی بیٹی کی حیثیت سے کل تک قابلِ رشک سمجھی جاتی تھی، اب ایک قاتل کی بہن کے طور پر کسی سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"شارق....." دہشت زدہ انداز میں چیختے ہوئے ثانیہ نے شارق کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر یک دم ہی وہ نظروں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا اور اب ثانیہ اپنے کمرے کے جس منظر میں تھی وہاں شارق نہیں تھا۔

شارق ساری دنیا میں کہیں نہیں تھا۔ وہ اسے محض اپنے خوابوں اور خیالوں میں ہی دیکھ سکتی تھی۔ مگر یہ بھی تم تھا کہ بہت خوب صورت انداز میں شروع ہونے والا خواب یا خیال ہر بار نہایت تکلیف دہ انداز میں ختم ہوتا تھا۔ وہ ہر بار اپنے خواب کے اختتام پر شارق کا خون میں نہایا ہوا چہرہ دیکھتی تھی۔ اس خون کی مقدار اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ اس کا آنچل اس کی سرخی کو سمیٹنے میں ناکام ہو جاتا تھا۔ ابھی ابھی وہ جس خواب سے جاگی تھی اس میں بھی یہی ہوا تھا۔

ثانیہ نے اس کے خون آلود چہرے کو اپنے آنچل سے صاف کرتے ہوئے اس کی شکل دیکھنی چاہی تھی۔ لیکن خون مسلسل بہہ رہا تھا اور وہ شارق کا چہرہ صحیح طرح سے دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ اسی کوشش کے دوران یکدم ہی شارق کے جسم نے جھٹکا کھایا اور ثانیہ چیختے

ہوئی نیند سے جاگ گئی۔ جاگنے کے بعد بھی اس کی حالت بہت دیر تک ایسی رہی جیسے وہ ابھی ابھی اس حادثے سے گزری ہو۔ حالانکہ اب تو کافی دن گزر چکے تھے شارق کو ان سے جدا ہوئے مگر وہ اس کی موت کو قبول نہیں کر پائی تھی۔ وہ ہر روز اس کے خواب میں آتا تھا۔

وہ دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے کے بہت قریب رہے تھے۔ دونوں کی عمروں میں چند ماہ کا فرق ہونے کی وجہ سے دونوں کے تعلیمی مراحل بھی ساتھ ساتھ طے ہوئے تھے۔ پھر بچپن کی یہ دوستی کس لمحے میں نوجوانی کی محبت میں تبدیل ہوئی' ان دونوں کو بھی اندازہ نہ ہو سکا۔ وہ تو جب یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے تھوڑے دنوں بعد ہی ثانیہ کی خالہ اس کے لیے ایک پرپوزل لے کر ان کے گھر پہنچیں تو شارق کو احساس ہوا کہ وہ ثانیہ کی جدائی قبول نہیں کر سکتا چنانچہ اس نے ثانیہ کو ہمیشہ اس گھر میں رہنے کا بندوبست کرنے کے لیے مسرت بیگم سے بات کی۔

ثانیہ اور شارق دونوں ہی زیر تعلیم تھے۔ اس لیے فوری طور پر ان کی شادی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا مگر ثانیہ کے لیے آنے والے رشتوں کی روک تھام کے لیے مسرت بیگم کو بھی یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس کی اور شارق کی باقاعدہ منگنی کر دی جائے۔ مبین احمد اور میمونہ کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا چنانچہ بڑی دھوم دھام سے دونوں کی منگنی کی تقریب منعقد کی گئی۔

منگنی والے دن اگر ثانیہ خوب صورت لباس جیولری اور میک اپ میں پیاری لگ رہی تھی تو شارق بھی اندرونی خوشی سے دمکتے چہرے کے ساتھ کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس روز ثانیہ کو صحیح معنوں میں شارق کی اپنے لیے محبت کا احساس ہوا تھا۔ وہ اتنا خوش تھا گویا اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ اس روز شارق کی خوشی دیکھ کر ثانیہ کو خود پر رشک محسوس ہوا تھا لیکن پھر وہ سب محبتیں خواب و خیال بن کر رہ گئیں۔ جانے کہاں سے اسد شیرازی نام کی عفریت ان کی زندگی میں چلی آئی جس نے ثانیہ کے شارق کو کسی خون آشام بلا کی طرح نگل لیا اور اب وہ چاہے جتنا بھی شارق کو پکارتی' وہ اس کی پکار پر اس کے پاس نہیں آنے والا تھا۔

وہ جو زندگی سے بہت محبت کرتا تھا' جسے ثانیہ کے ساتھ ایک لمبی عمر جینے کی بڑی چاہ تھی' منوں مٹی تلے جا سویا تھا۔ ثانیہ کی خواہش تھی کہ اسد شیرازی جیسے شقی القلب شخص کو اس کے جرم کی بھیانک سزا دی جائے۔

لیکن یہاں قسمت نے اسے ایک اور مات دی تھی۔ حاذق احمد جو شارق کا بڑا بھائی اور اس کے کیس کا مدعی تھا یک دم ہی پیچھے ہٹ گیا۔ ثانیہ کو اس کے پیچھے ہٹنے کی وجہ مدیحہ عثمان کی زبانی معلوم ہوئی تھی اور اسے لگا تھا کہ کوئی آسمان سر پر آگرا ہو۔ حاذق احمد نے جو کیا تھا' اس کے بعد آسمان کا سر پر آگرنا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

ثانیہ کو تو آج تک یقین نہیں آتا تھا کہ ایک سگا بھائی بھی یہ سب کر سکتا ہے۔ مگر یقین نہ کرنا بھی اس لیے ممکن نہیں تھا کہ اس نے اپنے سامنے ہی سب کچھ ہوتا دیکھا تھا۔ وہ بہت تڑپنے کے باوجود حاذق احمد کو روک نہیں سکی تھی کہ وہ فیصلے کا حق رکھتا تھا' پھر مسرت بیگم نے بھی شارق کی سگی ماں ہوتے ہوئے بھی حاذق کے فیصلے پر خاموشی اختیار کر لی تھی تو وہ صرف کزن اور منگیتر ہونے کے ناتے کیا کر سکتی تھی؟

اس کے اختیار میں تو صرف اتنا ہی تھا کہ وہ حاذق احمد سے ناراضی اختیار کر لے تو وہ اس نے اختیار کر رکھی تھی۔ اس کے ہر دن کا آغاز اور اختتام صرف ایک عہد کے ساتھ ہوتا تھا۔ ہر روز وہ خود سے ایک جملہ کہتی تھی۔

"میں حاذق احمد کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔" اور وہ اپنے اس عہد پر پوری شدت سے قائم تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ لندن جا رہے ہیں پاپا؟" دانیہ نے بے یقینی سے حسن شیرازی سے پوچھا۔

"ہاں' آج شام کی فلائٹ سے میں اور جیا روانہ ہو جائیں گے۔ پرسوں وہاں ہمیں ایک بہت اہم بزنس ڈیل کرنا ہے۔" حسن شیرازی نے جواب دیا۔

"مگر دو دن بعد تو بھائی کے کیس کی کورٹ میں ہیرنگ ہے۔ اتنے اہم موقع پر آپ کو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔" دانیہ نے حسن شیرازی کو احساس دلایا۔

"اسد اپنی ہی لائی ہوئی مصیبت کا شکار ہے۔ کس مشورہ دیا تھا اسے کہ ایک معمولی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو کر کسی کا مرڈر کر ڈالے۔ میں پہلے ہی اس کی وجہ سے بہت انسلٹ برداشت کر چکا ہوں' اب مزید کوئی نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا لندن کا یہ ٹرپ بہت ضروری ہے ورنہ پارٹی میرے ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

حسن شیرازی کا لہجہ بے حد بے نیاز اور الفاظ سخت بے رحم تھے۔ دانیہ ان کے اس انداز پر صدمے سے چور کچھ کہنے کے لائق بھی نہیں رہی۔ ایسا شخص جو اپنے جوان بیٹے کی زندگی پر اپنی عزت اور کاروبار کو ترجیح دیتا ہو' اس کے سامنے بھلا کہا بھی کیا جا سکتا تھا۔ آخر حسن شیرازی کو خود ہی اپنی بے رحمی کا اندازہ ہوا تو وہ اسے تسلی دینے کے لیے قدرے نرمی سے بولے۔

"تم فکر مت کرو۔ میں نے سارا انتظام کر لیا ہے۔ میرا وکیل کل ہی حاذق احمد کے وکیل سے مل کر سارے معاملے طے کر لے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرف سے خون بہا کے طور پر جب ان لوگوں کو بلینک چیک آفر کیا جائے گا تو وہ کیس واپس لے لیں گے۔ انہیں یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ مرنے والے کو واپس لانا کسی طور ممکن نہیں لیکن میری آفر مان کر وہ خود اپنے لیے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔"

حسن شیرازی کے پر رعونت لہجے میں گہرا تیقن تھا۔ اس یقین ہی کی وجہ سے دانیہ ان سے متفق نہ ہونے کے باوجود ان کی بات ماننے پر مجبور ہو گئی کہ آخر حسن شیرازی جیسے کھاک اور ذہین کاروباری شخص کا اندازہ غلط کیسے ہو سکتا ہے مگر اگلے دن جب حسن شیرازی لندن پہنچ چکے تھے' دانیہ کو ان کے وکیل کا فون موصول ہوا۔

شارق احمد کے لواحقین نے حسن شیرازی کا بلینک چیک قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ وکیل اس انکار پر شدید تشویش کا شکار تھا۔ اس نے بھی اس کیس کی کامیابی کی ساری امیدیں صرف اس ایک بات سے باندھ رکھی تھیں کہ شارق احمد کے ورثاء اس کے قتل کے بدلے میں خون بہا وصول کر کے اسد کے لیے معافی کا اعلان کر دیں' ورنہ خود اسد نے جس انداز میں اپنا جرم قبول کیا تھا اور اپنے اقبال جرم پر قائم تھا اس کے بعد عدالت سے اس کے لیے کسی نرم فیصلے کی امید نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

یہ جو حسن شیرازی کی یقین دہانی کے بعد کچھ مطمئن ہو گئی تھی' وکیل کی دی گئی اطلاع سن کر بری طرح پریشان ہو گئی۔ اسد اس کے کہنے پر اپنے بیان میں تبدیلی کرنے پر تیار نہیں ہو سکتا تھا' حسن شیرازی ملک سے باہر جا چکے تھے اور وکیل اپنے کوشش میں ناکام ہو چکا تھا۔ ایسے میں اگر عدالت اسد کے لیے کوئی سزا سنا دیتی تو وہ کیا کر پاتی؟ جو کچھ کرنا تھا وہ عدالت کے فیصلے سے پہلے ہی کرنا تھا کہ وہ اپنے اکلوتے بھائی کو ہرگز بھی کھونے کو تیار نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

قدرے تنگ زینہ طے کرتے دوسری منزل پر واقع اس آفس کی طرف جاتے ہوئے اس کے پیر ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ حاذق احمد نے اس پر جو نیٹی پابندی عائد کی تھی اس کے بعد اسے یہی راہ سجھائی دی تھی کہ وہ اس کے ساتھ اپنا معاملہ صاف کر لے۔ اسے صاف صاف بتا دے کہ وہ اس کے لیے اپنے دل میں کیا جذبات رکھتی ہے' تاکہ یہ روز روز مرنے والی کیفیت ختم ہو کر کوئی ایک فیصلہ ہو جائے۔ آج وہ آر یا پار کا ارادہ لے کر گھر سے نکلی تھی اور اب ایک پرانی عمارت میں واقع مبین احمد کے اس آفس کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں آج کل حاذق احمد اپنے چچا کی مدد کے خیال سے دن کے چند گھنٹے گزارتا تھا۔

حاذق احمد کے گھر اور یونیورسٹی کے علاوہ یہی تیسری جگہ تھی جہاں وہ اس سے بات کر سکتی تھی۔ گھر اور یونیورسٹی تو ثانیہ کی وجہ سے ممنوعہ علاقوں میں شامل ہو گئے تھے چنانچہ یہ آفس ہی وہ واحد مقام رہ جاتا تھا جہاں حاذق احمد سے ملاقات کا امکان تھا۔ وہ اس امکان کی ڈور پکڑ کر اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے آئی تھی بلکہ فیصلہ تو حاذق احمد کو کرنا تھا' اس کا تو یہ عالم تھا کہ حاذق احمد کے ایک "ہاں" پر جی اٹھتی اور ایک "نہ" پر جان سے گزر جاتی۔ امید و بیم کی شدید کشمکش میں اس نے دوسری منزل پر واقع آفس تک کا راستہ طے کیا تھا۔ آفس کے باہر احمد ماربلز کے الفاظ لکھے ہوئے تھے اور ایک چپڑاسی اسٹول پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

"مجھے مسٹر حاذق سے ملنا ہے۔" اونگھتے چپڑاسی کے سامنے رک کر اس نے اسے اپنی وہاں آمد کا مقصد بتایا۔ چپڑاسی نے جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس اس لڑکی کو حیرت سے دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

"مبین صاحب بھی اندر موجود ہیں؟" وہ جو بڑی ہمت کر کے یہاں تک آگئی تھی اب حاذق احمد کے ممکنہ ردعمل سے گھبرا رہی تھی اس لیے خواہش رکھتی تھی کہ جب وہ حاذق احمد کے روبرو ہو تو اس کے گھر کا کوئی دوسرا فرد وہاں موجود نہ ہو۔

"نہیں۔ وہ تو مارکیٹ میں دوکان پر ہیں۔ حاذق صاحب کے آفس آنے کے بعد وہ اپنا زیادہ تر وقت وہیں گزارتے

ہیں۔" چپڑاسی نے مستعدی سے اطلاع دی تو اس نے مطمئن ہوتے ہوئے اندر بند دروازے کو کھولنے کا اشارہ کیا۔

"میں حاذق صاحب کو آپ کے آنے کا بتا دوں۔" چپڑاسی نے کچھ ہچکچاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں خود ہی ان سے مل لوں گی۔" پُراعتماد نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے انکار کیا اور آفس کے اندر داخل ہو گئی۔

یہ ایک چھوٹا اور سادہ سا آفس تھا جیسا کہ عموماً چھوٹے کاروبار سے منسلک افراد کی ملکیت ہوتا ہے۔ بیرونی مختصر لاؤنج نما حصے میں ریگزین کا ایک صوفہ اور دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور ایک دیوار گیر الماری میں ماربل کے مختلف رنگوں اور ڈیزائنز کے نمونے سجے دکھائی دے رہے تھے۔ آگے جس کمرے کا دروازہ نظر آ رہا تھا' وہ باقاعدہ کوئی کمرا نہیں تھا بلکہ لکڑی کے پارٹیشن کی مدد سے اس بیرونی لاؤنج سے الگ کر کے ایک علیحدہ کمرے کی شکل دیا گیا تھا۔ حاذق احمد اس وقت یقیناً" اسی اندرونی کمرے میں تھا۔ اپنی نم ہوتی انگلیوں سے سامنے موجود دروازے کا لٹو گھما کر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ سامنے وہ کسی فائل میں سر دیے بیٹھا تھا۔ دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز پر اس نے فائل سے سر اٹھایا اور اسے سامنے پا کر دنگ رہ گیا۔

"ہیلو۔" اس کی حیرت کو محسوس کرتے ہوئے وہ ہمت کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوئی اور ساتھ ہی مسکرانے کی کوشش بھی کی۔

"تم ..... تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی؟" حاذق احمد جو حیرت سے ایک پل کے لیے بُت سا بن گیا تھا اس کی آواز سن کر گویا کسی طلسم سے آزاد ہوا۔

"معاملہ جب زندگی اور موت کا ہو تو ہمت کرنا ہی پڑتی ہے۔" اس نے یاسیت سے حاذق احمد کے سوال کا جواب دیا۔

"اب کس کی زندگی اور موت کا مسئلہ کھڑا ہو گیا جو تمہیں یہاں تک آنے کی زحمت کرنی پڑی؟" حاذق احمد نے طنز سے پوچھا۔

"میری اپنی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"میں اس بات کا مطلب نہیں سمجھا؟" حاذق احمد نے حیرانی کا اظہار کیا۔

"حالانکہ آپ کو سمجھنا چاہیے۔ آپ کو سمجھنا چاہیے کہ ایک لڑکی کیوں دیوانہ وار آپ کے گرد چکراتی ہے؟ کیوں آپ کی بے رخی کے باوجود بار بار آپ کے راستے میں آ کر کھڑی ہوتی ہے؟ کیوں اسے اپنے آرام دہ گھر کو چھوڑ کر آپ کے پیچھے بھاگتے پھرنے کا مرض ہو گیا ہے؟ آپ کو سمجھنا چاہیے حاذق احمد..... آپ کو سمجھنا چاہیے کہ وہ لڑکی آپ کی محبت میں مبتلا ہے۔ وہ آپ کو دیکھتی ہے تو اس کی سانسیں چلتی ہیں۔ اسے لگتا ہے کہ اگر آپ اس کی زندگی میں نہ ہوئے تو اس کے پاس زندہ رہنے کا کوئی ریزن (جواز) نہیں ہو گا۔ وہ لڑکی آپ کے بغیر مر جائے گی۔"

وہ جو سمجھتی تھی کہ حاذق احمد کے سامنے کچھ بھی کہنا بہت مشکل ہو گا جب کہنے پر آئی تو سب کچھ کہتی ہی چلی گئی۔ اور جب اپنی کہہ چکنے کے بعد اس نے حاذق احمد کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہاں اسے شدید غصے کی تمتماہٹ نظر آئی۔ جب وہ بولا تو اس کا غصہ اس کے ہر ہر لفظ سے جھلک رہا تھا۔

"تمہاری وجہ سے مجھے اور میری فیملی کو جو زخم لگا' اس کے بعد تم کیسے امید کر سکتی ہو کہ میں تمہارے جذبوں کی پذیرائی کر سکتا ہوں۔ تمہارے لیے میرے پاس نفرت اور غصے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر معاملہ اس سے مختلف ہوتا تب بھی تمہارے جیسی لڑکی میرے لیے قطعی قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی لڑکی جس کے لباس میں حیا ہو نہ گفتگو میں جھجک' مجھے کیسے پسند آ سکتی ہے۔ تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ محبت کا احترام کیا ہوتا ہے۔ محبت کے نام پر خود کو اور دوسرے کو تماشا بنا دینے والی لڑکی کو محبت کا دعوا زیب ہی نہیں دیتا۔ کوئی شریف اور باحیا لڑکی اگر کسی سے محبت کرتی ہے تو اس کا انداز یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی محبت کو پانے کے لیے سارے شہر میں سڑکوں پر ماری ماری پھرے اور منہ اٹھا کر جہاں جی چاہے وہاں پہنچ جائے۔ آج تم نے اس طرح یہاں آ کر میرے سامنے اپنا امیج پہلے سے بھی بہت زیادہ خراب کر لیا ہے۔ لیکن مجھے تمہارے اس عمل پر حیرت نہیں ہے تم جیسے مادر پدر آزاد طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکی جسے دین و مذہب کا کچھ علم نہ ہو' جسے کسی قسم کی اخلاقی تربیت نہ دی گئی ہو' جسے اللہ اور رسولؐ کا ڈر نہ ہو' وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔"

حاذق احمد کا لہجہ زہر میں ڈوبا ہوا تھا اور اس کا ایک ایک لفظ سنسناتے تیروں کی طرح اس کے وجود میں پیوست ہو

رہا تھا۔

"اپنی شریک حیات کے لیے دولت و حسن میرا معیار کبھی نہیں رہا۔ میں جب بھی' جس بھی عورت کو اپنی شریک حیات بناؤں گا' وہ ایک باحیا اور دین دار عورت ہو گی اور تم میں یہ دونوں ہی خصوصیات نہیں پائی جاتیں۔ تم جیسی بے دین اور شرم و حیا سے عاری لڑکی کے لیے میری زندگی میں نہ آج کوئی جگہ ہے اور نہ ہی آئندہ کبھی ہو سکتی ہے سو پلیز آئندہ ایسا کوئی سوال لے کر میرے سامنے آنے کی زحمت نہ کرنا بلکہ اگر تم میں تھوڑی سی بھی غیرت باقی ہے تو اس سے کام لے کر کسی بھی صورت میرے سامنے آنے سے گریز کرنا کیونکہ میں تم جیسی لڑکی کی شکل بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا۔"

کتنی نفرت تھی حاذق احمد کے لہجے میں اس کے لیے اس کا دل چاہا وہ یہیں کھڑے کھڑے مر جائے اور شاید وہ مر بھی گئی تھی بس ایک زندہ لاشہ تھا جسے گھسیٹتی جانے وہ کس طرح حاذق احمد کے آفس سے باہر نکلی تھی۔ اور شدید غائب دماغی کے باوجود پر ہجوم سڑکوں پر گاڑی دوڑاتی صحیح سالم اپنے گھر تک پہنچ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

دانیہ حسن نے اپنے پاس لکھے ایڈریس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے تسلی کی کہ وہ صحیح جگہ پہنچی ہے اور پھر اپنی گاڑی سے اتر آئی۔ یہ خوشحال متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کا ایک صاف ستھرا رہائشی علاقہ تھا جہاں آج وہ پہلی بار اپنی شدید ترین ضرورت کے تحت آئی تھی۔ اسے اپنے اکلوتے بھائی کے لیے زندگی طلب کرنی تھی اور یہ ایسی حاجت تھی جس کی خاطر وہ کہیں بھی جا سکتی تھی۔ حالانکہ یہاں آتے ہوئے اسے مسلسل یہ احساس بھی ستا رہا تھا کہ جن لوگوں سے وہ اپنے بھائی کی جان بخشی کی درخواست کرنے آئی ہے انہیں اس کے بھائی کی ذات سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے اور ان کے لیے معاف کر دینا مشکل ہو گا۔

اس کا ثبوت حسن شیرازی کی طرف سے وکیل کے ذریعے بھجوائے گئے بلینک چیک کی واپسی تھی۔ مگر دانیہ اسی لیے وہاں چلی آئی تھی کہ ممکن ہے وکیل نے کوشش نہ کی ہو یا کی بھی ہو تو بہرحال وہ اسد شیرازی سے کوئی خونی رشتہ تو نہیں رکھتا تھا کہ اپنی بات منوانے کے لیے سامنے والوں کے قدموں میں جا بیٹھتا۔ دانیہ حسن تو سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھی۔

"جی۔" کال بیل کے جواب میں دروازے پر آنے والی ادھیڑ عمر اداس چہرے والی عورت نے دانیہ کو دیکھ کر سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"مجھے حاذق صاحب سے ملنا ہے۔" دانیہ نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

"اندر آجاؤ۔" خاتون نے پیچھے ہٹ کر اسے اندر آنے کی جگہ دی۔

"حاذق نماز پڑھ رہا ہے۔ ٹریفک میں پھنسنے کی وجہ سے اس کی جماعت نکل گئی تھی' اس لیے گھر میں ہی نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔"

خاتون نے خود بھی نماز کے انداز میں دوپٹہ لپیٹ رکھا تھا اور حاذق کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ دانیہ خاموشی سے ان کے پیچھے چلتی رہی۔ وہ اسے لے کر ایک سادہ سے کمرے میں آ گئیں۔ یہاں ایک صوفہ سیٹ اور بڑا سا تخت بچھا ہوا تھا۔ تخت پر رحل پر رکھا قرآن شریف بہت نمایاں تھا۔ شاید وہ قرآن کی تلاوت کرتے کرتے ہی ڈور بیل کی آواز پر دروازہ کھولنے آ گئی تھیں۔

"میں حاذق کی امی ہوں۔ تم یقیناً" اس کی کوئی اسٹوڈنٹ ہو گی؟"

اپنا تعارف کرواتے ہوئے انہوں نے دانیہ کے بارے میں اندازہ لگایا۔ دانیہ نے اثبات میں سر ہلا کر ان کے خیال کی تصدیق کر دی۔ تعارف کے اس مرحلے سے پہلے وہ ان کے اشارے پر ایک صوفے پر نشست سنبھال چکی تھی۔

"تم بیٹھو۔ میں حاذق کو تمہارے آنے کا بتاتی ہوں۔" پل بھر کے لیے ہی تخت پر ٹکنے کے بعد وہ بولتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئیں۔ دانیہ ان کے جانے کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھی ہاتھ مسلتی رہی۔ وہ سخت نروس تھی۔

"حاذق' بس ابھی دو منٹ میں آ رہا ہے۔ تب تک تم یہ کولڈ ڈرنک پیو۔"

ان کی واپسی دو تین منٹ کے اندر ہی ہو گئی تھی اور وہ خالی ہاتھ واپس نہیں آئی تھیں۔ دانیہ ان کی طرف سے کی جانے والی اس تواضع پر مزید نروس ہو گئی۔ یہ خاتون جو اس سے اتنی خوش اخلاقی سے بات کر رہی تھیں اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ سامنے بیٹھی لڑکی ان کے بیٹے کے قاتل کی بہن ہے تو ان کا رویّہ جانے کیا ہوتا؟

"اس کی ضرورت نہیں تھی آنٹی! مجھے صرف سر حاذق سے اور آپ سے تھوڑی سی بات کرنی تھی۔" دانیہ نے گلاس تھامنے سے اجتناب کیا۔

"بات بھی کرلینا' پہلے یہ تو پی لو۔ میں نے کون سا بہت تکلف کیا ہے۔ بس فریج سے بوتل نکال کر گلاس میں کولڈ ڈرنک انڈیلی اور تمہارے سامنے لے آئی۔ ثانیہ گھر میں ہوتی تو کچھ اہتمام بھی کرتی۔ یہ بیٹیاں ایسے ہی عادت بگاڑ دیتی ہیں کہ نہ ہوں تو ماؤں سے کچھ کیا ہی نہیں جاتا۔" دانیہ کی بات پر غور کیے بغیر وہ اپنی ہی کہے گئیں اور زبردستی اسے گلاس تھمادیا۔

"ثانیہ کہاں گئی ہے؟" دانیہ نے یونہی ان سے پوچھ لیا۔

"بس کیا بتاؤں؟ جب سے شارق گیا ہے' اس کی حالت سنبھل ہی نہیں رہی۔ بار بار بیمار ہو جاتی ہے۔ اب بھی اس کے ماں باپ اسے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہوئے ہیں۔"

انہوں نے بہت ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتایا تو دانیہ کی نظریں خود بخود جھک گئیں اس گھرانے کو یہ عظیم دکھ پہنچانے والا اس کا سگا بھائی تھا وہ اس بات کو سوچ کر بار بار کانپ جاتی تھی۔ ابھی تک اس نے ہاتھ میں پکڑے کولڈ ڈرنک کے گلاس سے ایک گھونٹ بھی نہیں لیا تھا۔ خاتون اصرار کرتیں اس سے قبل حاذق احمد وہاں چلا آیا۔

"آپ؟" دانیہ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت اتری۔ دانیہ ہاتھ میں تھاما گلاس قریبی تپائی پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کس سلسلے میں تشریف لائی ہیں آپ یہاں؟" اس کا انداز اچھا خاصا روکھا تھا اور یہ روکھا پن اس کی شخصیت کا حصہ ہرگز نہیں تھا۔ یہ بات دانیہ حسن بطور ایک شاگرد بھی جانتی تھی اور حاذق کی والدہ کے چہرے پر موجود حیرت بھی گواہی دے رہی تھی کہ ان کے لیے اپنے بیٹے کا یہ انداز اجنبی ہے۔

"وجہ آپ جانتے ہیں۔ ہمارے وکیل نے اس سلسلے میں آپ کے وکیل سے بات کی تھی مگر آپ کی طرف سے انکار ہو گیا۔ اب میں خود آپ لوگوں سے درخواست کرنے آئی ہوں۔"

دانیہ نے بہت سنبھل کر بات کی تھی لیکن حاذق کی والدہ کے چہرے کے بدلتے تاثرات نے اسے احساس دلایا تھا کہ انہیں اس کی حقیقت جان کر دکھ پہنچا ہے۔

"جواب اب بھی وہی ہے۔ میرے بھائی کا خون اتنا ارزاں نہیں کہ کوئی اس کی قیمت لگا سکے۔" حاذق احمد نے تڑختے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"میں جانتی ہوں۔ میں آپ کا دکھ سمجھ سکتی ہوں۔ آپ نے اپنا بھائی کھویا ہے اور میں اپنے بھائی کو کھونے کے خوف میں مبتلا ہوں۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ کسی اپنے کو کھونا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن پھر بھی میں یہاں آئی ہوں کہ آپ لوگ میرے بھائی کو معاف کردیں۔ وہ پھانسی چڑھ گیا تب بھی آپ کو اپنا بھائی واپس نہیں مل سکتا مگر آپ اگر ہماری آفر ایکسیپٹ کرلیں تو میرے بھائی کی زندگی بچ سکتی ہے۔"

دانیہ کو خوب اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے پاس وہ الفاظ نہیں جن میں وہ سامنے والے کو قائل کرنے کے لیے دلائل دے سکے۔

"آپ کے بھائی نے قتل کیا ہے۔ وہ اگر پھانسی چڑھے گا تو اپنے جرم کے سبب۔ مگر میرا معصوم بھائی تو بالکل بے گناہ مارا گیا ہے اور آپ چاہتی ہیں کہ میں اس کے قاتل کو ذرا سے مال کے بدلے معاف کردوں۔ اس سودے پر تو اس کی روح تڑپ اٹھے گی۔" حاذق احمد تہذیب کے دائرے میں بات کرنے کے باوجود اپنے غم و غصے کو مکمل طور پر چھپانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں میرے بھائی نے جرم کیا ہے لیکن یقین مانیں وہ برا انسان نہیں ہے۔ جب وہ حادثہ پیش آیا تھا تو وہ بہت فرسٹریشن کا شکار تھا۔" دانیہ نے اسد شیرازی کی وکالت کی۔

"بہت خوب کیا کہنے ہیں آپ کے بھائی کے کہ وہ فرسٹریشن میں لوگوں کی جان لیتے پھرتے ہیں۔ اگر اس کی طرح سارے لوگ اپنی فرسٹریشن کو اسی طرح نکالنے لگیں تو آدھا ملک قاتل بن جائے لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ اسد شیرازی جیسے لوگ ہی اپنی فرسٹریشن اس طریقے سے نکال سکتے ہیں کیونکہ انہیں زعم ہوتا ہے کہ اپنے باپ کی دولت کے بل بوتے پر بڑے سے بڑے جرم کے بعد بھی بچ نکلیں گے۔" حاذق احمد کی تلخی بے جا نہیں تھی اس نے اپنا بہت پیارا' گبھرو جوان بھائی کھویا تھا۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرے بھائی بالکل بھی ایسے انسان نہیں ہیں۔ انہیں اپنے جرم پر شرمندگی ہے۔ وہ تو اپنا جرم قبول کر کے اس کے سزا پانے کو بھی تیار ہیں لیکن میں..... میں کیسے اپنے بھائی کو موت کے منہ میں جاتا دیکھوں؟" دانیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"ویسے ہی جیسے ہم نے اپنے بے قصور بھائی کے بے جان وجود کو دیکھا۔ آپ کے پاس تو پھر بھی یہ تسلی ہو گی کہ آپ کے بھائی کو اس کے جرم کی سزا ملی۔" حاذق احمد کا غم اتنا بڑا تھا کہ وہ اپنے اندر لچک لا ہی نہیں سکتا تھا۔

"آنٹی پلیز! آپ میری بات مان لیں۔ آپ انہیں سمجھائیں کہ اسد بھائی کو معاف کردیں۔" حاذق احمد کی ہٹ دیکھ کر دانیہ اب تک خاموش تماشائی بنی مسرت بیگم کی طرف متوجہ ہو گئی اور روتے ہوئے ان سے درخواست کی۔

"امی مجھ سے ایسا کچھ نہیں کہہ سکتیں کیونکہ یہ صرف میرا ہی نہیں ہماری پوری فیملی کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اسد شیرازی جیسے شقی القلب شخص کو ہرگز بھی معاف نہ کیا جائے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ یہاں سے تشریف لے جائیں اور اپنا اور ہم لوگوں کا وقت ضائع نہ کریں۔"

مسرت بیگم کے کچھ بھی کہنے سے قبل حاذق نے دخل اندازی کرتے ہوئے اسے مشورہ دیا مگر دانیہ اس مشورے کو قبول کرنے تو یہاں نہیں آئی تھی اسے ہر حال میں اپنے بھائی کے لیے جاں بخشی کی نوید لے کر ہی یہاں سے اٹھنا تھا سو اس نے بلکتے ہوئے حاذق احمد کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"پلیز! پلیز معاف کردیں میرے بھائی کو۔ اس پر نہیں تو مجھ پر رحم کھائیں۔ میرے لیے میرا بھائی سب کچھ ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی؟"

"سوری۔ مجھے افسوس ہے مگر میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔" حاذق احمد اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

"آپ کو قرآن پاک کا واسطہ' آپ اس مقدس کتاب کے واسطے سے میرے بھائی کی جان بخش دیں۔"

حاذق کا اس درجے کٹھور پن دیکھ کر دانیہ کو اور کچھ نہ سوجھا تو رحل پر رکھا قرآن شریف دونوں ہاتھوں میں لے کر حاذق احمد کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

اس کی اس حرکت پر حاذق احمد کو کرنٹ سا لگا۔ اور اس نے ایک زوردار تھپڑ دانیہ کے چہرے پر رسید کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے قرآن جھپٹ لیا۔ مسرت بیگم بھی اس کی حرکت پر بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور خالی خالی نظروں سے فرش پر بیٹھ کر روتی دانیہ اور شدتِ جذبات سے تڑختے حاذق احمد کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

"اٹھو! اور فوراً" یہاں سے چلی جاؤ۔ معاف کیا میں نے تمہارے بھائی کو اپنے بھائی کا خون۔" بے پناہ غصے سے ادا کیے گئے اس کے یہ الفاظ دانیہ حسن کے لیے کانوں میں رس گھولتے امرت سے کم نہیں تھے۔

"تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ۔" وہ یک دم ہی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور حاذق احمد اور مسرت بیگم کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے ممنونیت سے بولی۔ اس وقت اس پر جو کیفیت طاری تھی' اس میں اسے اپنی آنکھوں سے بے تحاشا بہتے ہوئے آنسوؤں اور رخسار پر چھپ جانے والے حاذق احمد کی انگلیوں کے نشانات کا بھی ہوش نہیں تھا۔

"بس اب جاؤ۔ یہاں کسی کو تمہارے شکریے کی ضرورت نہیں۔ شارق کا خون تمہاری درخواست پر نہیں بلکہ قرآن پاک کی حرمت کی خاطر معاف کیا گیا ہے۔" حاذق نے بے حد سرد لہجے میں کہتے ہوئے دانیہ کو باہر کا راستہ دکھایا۔ اس بار وہ بنا کچھ کہے بیرونی راستے کی طرف بڑھ گئی۔

"امی! مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں شارق کا خون کسی قیمت پر معاف نہیں کرتا لیکن مجھے کتاب اللہ کی حرمت کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑا۔" دانیہ کے باہر نکلنے کے بعد حاذق نے گم صم سی مسرت بیگم کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے ان سے کہا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کیا بیٹا! اگر اس لمحے تم قرآن کی حرمت کا پاس نہ کرتے تو میں زندگی بھر تمہیں معاف نہیں کرتی۔"

مسرت بیگم نے حاذق کو جواب دیا اور پھر اس کا بازو اپنے شانے سے ہٹاتے ہوئے اسی انداز میں تخت پر بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگیں جس انداز میں دانیہ حسن کی آمد سے پہلے کر رہی تھیں فرق صرف اتنا تھا کہ اب ان کے آنسو بے حد تسلسل سے بہتے قرآن پاک کے صفحوں کو بھی تر کرتے جا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے لیے میرے پاس نفرت اور غصے کے سوا کچھ نہیں ہے۔" حاذق احمد کا زہر میں ڈوبا لہجہ اس کی یادداشت

سے نکل ہی نہیں سکتا تھا۔

"ایسی لڑکی جس کے لباس میں حیا ہو' نہ گفتگو میں جھجک۔ مجھے کیسے پسند آسکتی ہے؟"

کتنی حقارت سے اس نے اس کی ذات کو ٹھکرایا تھا۔ وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے سراپے کا جائزہ لینے لگی۔ جینز کی نیلی پینٹ اور گہرے سرخ رنگ کی چست ٹی شرٹ میں پہلے کے مقابلے میں بہت حد تک ماند پڑ جانے کے باوجود اس کا حسن دمک رہا تھا لیکن حاذق احمد کی نظریں اس حسن سے متاثر ہونے کے بجائے اس کی بے باکی پر برہم ہوئی تھیں۔ وہ عورت کے اس روپ کو پسند کرنے والوں میں سے نہیں تھا مگر وہ کیا کرتی کہ اسے کبھی کسی نے بتایا ہی نہیں تھا کہ باحیا لباس کیا ہوتا ہے' وہ بچپن سے یہی سب کچھ پہنتی آئی تھی اور اس کی کلاس میں اسے قطعی معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

"تم جس جذبے کو محبت کا نام دیتی ہو' وہ محبت نہیں ہوس ہے۔"

وہ تو اسے اتنا پست سمجھتا تھا کہ محبت کرنے کے فطری جذبے پر بھی اس کا حق نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی نظر میں وہ اس لائق ہی نہیں تھی کہ محبت کر سکتی اور حاذق احمد کی اس بات کو سن کر بھی اس کے دل کی دھڑکنیں جاری تھیں خود اس کے لیے حیرت کا مقام تھا۔ اس نے کہا تھا۔

"تمہیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ محبت کا احترام کیا ہوتا ہے؟" اور اس مقام پر آکر وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ واقعی اپنے جنون میں اس نے حاذق احمد کی ذات کو تماشا بنا دیا تھا۔ وہ جو ایک معزز استاد تھا یونیورسٹی میں ایک لڑکی کی خود پر غیر معمولی توجہ پر اپنے کولیگز اور اسٹوڈنٹس کے سامنے جانے کس قدر شرمندگی محسوس کرتا ہوگا۔ پھر اس کی وہ حاذق احمد کے گھر کے قریب گاڑی لے کر کھڑے ہونے اور اس کا پیچھا کرنے والی حرکت.....

وہ بے چارا تو اپنے پڑوسیوں اور جان پہچان والوں کے سامنے نکو بن گیا ہوگا۔ اس پر وہ اس کے روکنے پر اس کے چچا کے آفس میں اپنی محبت کا اظہار کرنے جا پہنچی تھی۔ اگر اس وقت اس کے چچا بھی وہاں ہوتے یا کوئی کاروباری ملاقاتی ہی آیا ہوا ہوتا تو اسے اپنے پیچھے وہاں آجانے والی لڑکی کی آمد پر کتنی سبکی اٹھانی پڑتی یعنی حاذق احمد کا اس پر غصہ ناجائز نہیں تھا پھر اس کے غصے اور نفرت کی یہی چند وجوہات تو نہیں تھیں۔ سب سے بنیادی اور بڑی وجہ تو اس کا دانیہ حسن شیرازی ہونا تھا۔ وہ دانیہ حسن شیرازی جس کے بھائی اسد شیرازی نے حاذق احمد کے لاڈلے بھائی کو اس سے چھین لیا تھا اور وہ صرف اور صرف دانیہ حسن کی وجہ سے اسے معاف کر دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

کیسی آزمائش کی گھڑی تھی وہ' جب حاذق احمد نے نہ چاہتے ہوئے بھی قرآن کی حرمت کا پاس رکھتے ہوئے دانیہ حسن کو اس کے بھائی کی زندگی دان کر دی تھی۔ اس روز حاذق احمد کے گھر سے نکلتے ہوئے دانیہ حسن اپنے رخسار پر صرف اس کی انگلیوں کا نقش ہی نہیں لائی تھی بلکہ حاذق احمد کی محبت بھی اس کے دل پر نقش ہو گئی تھی۔ حاذق احمد جسے اس نے اس لمحے سے قبل بھی بے شمار بار دیکھا تھا اور جو اس کے لیے ایک محنتی اور ذہین استاد سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔

اس لمحے کے بعد سے سب کچھ ہو گیا تھا۔ اس لمحے اس نے جس حاذق احمد کو دیکھا تھا' وہ کوئی بہت ہی مختلف شخص تھا جس کے چہرے پر موجود غیض و غضب کے باوجود دانیہ حسن نے کوئی انوکھی سی چیز دیکھی تھی۔ شاید وہ اس کی کتاب اللہ سے محبت کا جلال تھا جس نے اس کے چہرے کو بے حد غیر معمولی اور پُرنور بنا دیا تھا اور دانیہ حسن اس نور کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھی۔ وہ حاذق احمد کے گھر سے اپنے بھائی کے لیے زندگی کی نوید کے ساتھ اپنے لیے محبت کا تحفہ بھی لائی تھی لیکن حاذق احمد نے سچ کہا تھا کہ وہ اس جذبے کے احترام کو نہیں سمجھتی تھی' اس نے خود کو ملنے والی نعمت کے مطابق اپنا ظرف بڑا نہیں کیا تھا اور یہ ظرف کی کمی ہی تھی جو اسے دیوانگی کی راہ پر لے آئی تھی۔ وہ اپنی اور حاذق احمد دونوں کی عزت کے خیال سے بے پروا ہو گئی تھی۔ اس دیوانگی میں کچھ دخل اس کے جذبوں کی زور آوری کا تھا تو کچھ اس کی تربیت کے فقدان کا۔ مگر آج حاذق احمد نے جو کچھ کہا تھا اس کے بعد وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"آپ کو میرا لباس و انداز پسند نہیں ہے' آپ اپنی لائف پارٹنر کو باحیا اور دین دار دیکھنا چاہتے ہیں تو میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں آپ کو آپ کی پسند کے روپ میں ڈھل کر دکھاؤں گی۔"

آئینے میں دکھتی اپنی آنکھوں پر نظریں جمائے اس نے حاذق احمد سے عہد کیا۔ ان آنکھوں میں بسا حاذق احمد

تمس وہ آئینے میں صاف دیکھ سکتی تھی سو وہ حاذق احمد کے عدم التفات کو تسلیم کرنے کے باوجود اس الزام کو قطعی نہیں ٹال سکتی تھی کہ اس کے دل میں حاذق احمد کے لیے دھڑکتے جذبے کو محبت کے سوا کوئی اور نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

بلند آہنگ موسیقی کی آواز نے پورے گھر میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ دانیہ نے اپنے کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں بند کر رکھی تھیں اس کے باوجود وہ یکسوئی سے اپنے سامنے رکھے قرآن شریف کی تلاوت کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ آج کل جیا کو یہ نیا شوق چڑھا تھا۔ اپنی گھر میں موجودگی کے دوران وہ جب بھی دل چاہتا بلند آواز میں میوزک لگا دیتی۔ موسیقی کی یہ آواز اتنی بلند ہوتی تھی کہ اچھا خاصا بڑا گھر بھی اس سے گونج اٹھتا۔ اتفاق سے دانیہ کا تو کمرا بھی جیا کے کمرے سے قریب تھا اس لیے وہ زیادہ ہی ڈسٹرب ہوتی تھی۔ پھر آج کل وہ اپنی زندگی کے جس دور سے گزر رہی تھی وہ یوں بھی بڑا نازک تھا۔ ایک طرف اسے حاذق احمد کے پسند کے روپ میں ڈھلنے کی خواہش تھی تو دوسری طرف وہ اس کے دیدار سے محرومی کی آزمائش سے گزر رہی تھی۔

وہ اپنی توجہ حاذق احمد کی پسند کے سانچے میں ڈھلنے پر مرکوز رکھنے کی کوشش کرتی تھی مگر یہ بڑا صبر آزما عمل تھا۔ بچپن سے پڑی ہوئی عادتیں آسانی سے چھوٹنے والی نہیں تھیں۔ ڈھیلے ڈھالے شلوار قمیص اور دوپٹوں میں اسے اپنا وجود عجیب سا لگتا تھا۔ پھر نماز کی پابندی کا مسئلہ تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں شاید ہی کبھی نماز پڑھی تھی اس لیے اب مقررہ اوقات پر نماز کے لیے کھڑا ہونا ہی اچھا خاصا مسئلہ بن جاتا تھا۔ اس کے علاوہ نماز کا طریقہ اور نماز میں پڑھی جانے والی سورتیں اور دعائیں بھی اسے یاد نہیں تھیں۔ یہ باتیں سیکھنے کے لیے وہ کتابوں کا سہارا لے رہی تھی یہ بھی آسان نہیں تھا۔ اس نے قرآن مجید پڑھنا بچپن میں کبھی ایک استاد اس مقصد کے لیے ان کے گھر آتے تھے لیکن یہ سلسلہ دو تین ماہ سے زیادہ نہیں چلا تھا وہ استاد صاحب اپنے گاؤں واپس چلے گئے تھے۔ سونیا اور حسن شیرازی دونوں ہی اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس لیے دوبارہ کوئی نیا استاد اس مقصد کے لیے نہیں رکھا گیا۔

دانیہ نے اپنی قدرتی ذہانت کی وجہ سے اسکول و کالج میں اسلامیات کے پرچے تو ہمیشہ کلیئر کر لیے لیکن قرآن پاک کی تلاوت کے رموز نہ سیکھ سکی۔ اب نماز کے لیے بنیادی مسئلہ سورتوں کو یاد کرنے کا تھا۔ وہ اپنے طور پر کوشش کر رہی تھی کہ چند چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کر لے مگر ابھی تک صرف ایک ہی سورت یاد کر سکی تھی اور اسی کی مدد سے نماز پڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے قرآن کی مزید سورتیں یاد کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اب جیا کا نیا معمول اس کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ کبھی نماز کے دوران اور کبھی قرآن پڑھنے کے دوران اچانک ہی گھر میں موسیقی کی آواز گونجنے لگتی' اور اس کا سارا ارتکاز بکھر جاتا۔ اس وقت بھی یہی ہوا اور وہ بری طرح جھنجلا گئی اس نے ایک ملازمہ کے ذریعے جیا کو آواز کم کرنے کا پیغام بھجوایا اور انتظار کرنے لگی کہ آواز کم ہو تو اگلی آیت یاد کرے مگر آواز کم نہیں ہوئی اور پیغام لے کر جانے والی ملازمہ واپس آگئی۔

"کیا ہوا؟ تم نے کہا نہیں ان سے کہ آواز کم کر لیں؟" ملازمہ کو دیکھ کر اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

"جی کہا تھا۔" ملازمہ نے دبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"پھر؟" دانیہ نے مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ کہہ رہی ہیں کہ یہ گھر ان کا ہے' اس لیے کوئی ان پر حکم نہیں چلا سکتا۔ اگر کسی کو کچھ برا لگتا ہے تو وہ یہاں سے جا سکتا ہے۔"

ملازمہ نے جیا کے الفاظ سنائے جنہیں سن کر دانیہ کے سارے وجود میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اسی غصے کے عالم میں اپنے کمرے سے نکل کر جیا کے کمرے میں پہنچی۔ جیا موسیقی کے ساتھ بڑی لگن سے ڈانس کر رہی تھی۔ دانیہ نے ہاتھ مار کر میوزک بند کیا تو وہ چونک گئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ کسی نے تمہیں مینرز نہیں سکھائے؟" دانیہ کو سامنے پا کر اس نے تیکھے چتونوں کے ساتھ اس سے پوچھا۔

"مجھے مینرز سکھائے گئے ہیں یا نہیں مگر مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ آپ کو قطعی کسی گھر میں رہنے کے مینرز نہیں آتے۔" آج پہلا موقع تھا کہ اس کے یوں جیا سے متصادم ہونے کی نوبت آئی تھی ورنہ اس سے پہلے

تو وہ خود اتنی محدود رہتی تھی کہ جیا اور اس کی آپس میں گفتگو کی بھی نوبت نہیں آتی تھی۔

"گھر میں رہنے کے مینرز اور رولز گھر کے مالک بناتا ہے اور اس گھر کی مالک میں ہوں۔" جیا نے دانت کچکچاتے ہوئے دانیہ کو جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" دانیہ اس کے جواب پر چونکی۔

"مطلب اپنے باپ سے پوچھو جس نے یہ گھر مہر میں میرے نام لکھا ہے۔"

جیا نے نخوت سے جواب دیا جسے سن کر دانیہ کچھ بھی کہنے کے لائق نہیں رہی۔ وہ گھر جس میں اب تک وہ مالکانہ حقوق کے ساتھ رہتی آئی تھی' اب اس کا نہیں رہا تھا۔ اب اس کی سوتیلی ماں جیا اس گھر کی مالک تھی۔ یہ انکشاف اتنا تکلیف دہ تھا کہ اس سے مزید وہاں ٹھہرا نہیں گیا اور وہ جیا کے کمرے سے ہی نہیں گھر سے بھی نکل پڑی۔

حسن شیرازی کی یہ ناانصافی کہ انہوں نے اپنی اولاد کو محروم کرکے اس گھر کا جہاں ان لوگوں کی بچپن اور نوجوانی کی بے شمار یادیں بکھری تھیں' اپنی نئی نویلی بیوی کو مالک بنا دیا تھا قطعی ناقابل قبول محسوس ہو رہی تھی۔

اسے باقی کی دولت اور جائداد سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن وہ یہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی کہ کوئی اور اس گھر کا مالک بن کر اسے وہاں سے بے دخل کرنے کی کوشش کرے۔ غصے اور الم کی اس کیفیت میں وہ اِدھر اُدھر گاڑی دوڑاتی شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں گھومتی پھری۔ بالآخر اس کی گاڑی کا پیٹرول ختم ہو گیا اور گاڑی ایک جگہ اڑ کر کھڑی ہو گئی۔ دانیہ حسن نے گاڑی کو وہیں چھوڑا اور پیدل ہی چلنے لگی۔ اسی منتشر کیفیت میں اس کی نظر ایک مزار پر پڑی وہاں لوگوں کا ہجوم لگا تھا اور لوگ اندر آجا رہے تھے۔

اور وہ بہت سے لوگوں کے ساتھ مزار کے احاطے میں داخل ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"اس گھر میں آخر کیا ہو رہا ہے؟ سارے لوگ ایک جگہ رہنے کے باوجود کیوں الگ الگ دائروں میں جی رہے ہیں؟" صبوحی جو شارق کے انتقال کے تقریباً" تین سال بعد دوبارہ پاکستان آئی تھی' اپنے میکے کے معمولات کا جائزہ لے کر دو دن میں ہی چیخ پڑی۔

"کیا کہہ سکتے ہیں۔ میں اور تمہارے چچا چچی تو اب عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں زندگی بندھے معمولات کے مطابق ہی چلتی ہے۔ رہے حاذق اور ثانیہ تو ان دونوں ہی کا حال تم نے دیکھ لیا ہو گا۔ دونوں کے پاس اپنے کاموں سے فرصت ہی نہیں ہوتی۔" مسرت بیگم نے تھکے ہوئے انداز میں صبوحی کی بات کا جواب دیا۔

"لیکن امی! یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ مانا کہ جو حادثہ گزرا بہت بڑا تھا لیکن زندگی اس طرح تو نہیں گزرتی۔ ان تین سالوں میں یہاں بہت کچھ بدل جانا چاہیے تھا۔ ثانیہ تعلیم سے فارغ ہو چکی ہے اور حاذق بھائی اپنی جاب میں سیٹ ہیں تو پھر آپ لوگوں نے اب تک ان دونوں کی شادی کے بارے میں کوئی کوشش کیوں نہیں کی۔ دونوں کی شادیاں ہوتیں۔ تو نئی مصروفیات اور نئے لوگوں کی موجودگی کے باعث سب کچھ بدل جاتا۔"

صبوحی جو شارق کی موت پر پاکستان اس عالم میں آئی تھی کہ اس کے لیے اپنے ہوش و حواس قائم رکھنا مشکل ہو رہا تھا اب بہت سنبھل چکی تھی اور ایک جہاں دیدہ عورت کی طرح گھر کے مسائل پر غور کر رہی تھی۔

"ہم کیا سمجھتی ہو ان تین سالوں میں ہم لوگوں نے کوئی کوشش نہیں کی ہو گی۔ مگر ان دونوں میں سے کوئی ہماری بات سنے بھی تو۔ ثانیہ تو سرے سے یہ ذکر سننے کے لیے راضی نہیں ہوئی اور حاذق" "ابھی رک جائیں۔" کہہ کر بات ٹال دیتا ہے۔" مسرت بیگم کے انداز میں بے بسی تھی۔

"آپ فکر نہ کریں اب میں آئی ہوں تو یہ معاملات نمٹا کر ہی جاؤں گی۔ میرے سسرال میں بڑی پیاری پیاری اور پڑھی لکھی لڑکیاں ہیں۔ حاذق بھائی کے لیے ان میں سے کوئی مناسب لڑکی آپ ان کے مشورے سے منتخب کر سکتی ہیں۔" صبوحی بڑی پُرجوش تھی۔

"اچھا ہے اب تم ہی اپنے بھائی سے نمٹو۔ مجھے تو ثانیہ کی بھی بڑی فکر ہے۔ خواہش تو یہ بھی کہ اسے ہی حاذق کی دلہن بنا لیتی مگر وہ حاذق سے جتنی بدگمان ہے اس کے اس ذکر کو چھیڑنا ہی بیکار ہے۔" مسرت بیگم کی اس بات پر صبوحی کچھ چپ سی ہو گئی۔ شارق کے قاتل کو معاف کر دینے کے حوالے سے تو اس کے اپنے دل میں بھی چبھن تھی لیکن حاذق اور مسرت بیگم دونوں نے ہی اس سلسلے میں لب نہیں کھولے تھے اور ظاہر ہے انہیں مجبور نہیں کیا جا

سکتا تھا۔

"ثانیہ کے لیے میرے پاس ایک رشتہ ہے امی! میرا خیال ہے اس سے شادی کا خواہش مند ہے۔ میری شادی کے موقع پر اسے ثانیہ پسند آگئی تھی لیکن پھر شارق اور اس کے رشتے کی بات سن کر وہ چپ ہو گیا۔ اس بار میں آئی تھی تو اظفر نے مجھ سے خاص طور پر ثانیہ کے لیے بات کی تھی۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد صبوحی نے مسرت بیگم کو بتایا۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔ اظفر اچھا لڑکا ہے مگر بات وہی ہے کہ ثانیہ مانے ورنہ رشتے تو اس سے پہلے بھی بہت اچھے اچھے آچکے ہیں۔" مسرت بیگم نے تبصرہ کیا۔

"اسے ہم سب مل کر منائیں گے۔ وہ ہمیں اپنے شارق کی طرح ہی پیاری ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اسے یونہی خوشیوں سے دور تنہا رہنے دیں۔" صبوحی کے لہجے میں عزم تھا۔ مسرت بیگم نے چپکے سے اسے اس کے مقصد میں کامیابی کی دعا دی۔

☆ ☆ ☆

"کہاں ہوتی ہو ثانیہ! جب سے آئی ہوں تمہارے پاس مجھ سے ڈھنگ سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں۔" رات کے کھانے کے بعد صبوحی نے ثانیہ کو اس کے کمرے میں جا پکڑا۔ وہ اس وقت بھی کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی کسی کام میں مصروف تھی۔

"سوری آپی! مجھے خود بھی احساس ہے کہ میں آپ کو صحیح طرح وقت نہیں دے پا رہی۔ مگر آپ فکر نہ کریں ایک دو دن میں میں فارغ ہو جاؤں گی۔ اصل میں اس وقت ہمارے ادارے میں آڈٹ کا کام چل رہا ہے اس لیے میں سارا ریکارڈ ٹین ٹین کرنے میں لگی ہوئی ہوں۔ آپ دیکھ رہی ہیں نا کہ روزانہ گھر پر بھی کام لانا پڑ رہا ہے۔" ثانیہ نے معذرت خواہانہ انداز میں اپنی مصروفیات بیان کیں۔

"تمہیں ضرورت ہی کیا پڑی تھی یہ نوے پانچ والی جاب کرنے کی۔ آرام سے گھر میں رہتیں اور اگر جاب کرنی ہی تھی تو کوئی پارٹ ٹائم جاب کر لیتیں۔" صبوحی نے اعتراض کیا۔

"ضرورت مادی نہیں روحانی تھی۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں جس ادارے میں جاب کر رہی ہوں وہاں میری کیسی کیسی مظلوم' دکھیاری اور ستم رسیدہ خواتین سے ملاقات ہوتی ہے۔ ان عورتوں کے دکھ اور مسائل سن کر تو میں اپنا دکھ بھولنے لگتی ہوں۔" ثانیہ نے بے حد اداسی سے صبوحی کو جواب دیا۔

"چچی نے بتایا تھا مجھے تمہاری جاب کی نوعیت کے بارے میں۔ بڑی اچھی بات ہے کہ تمہیں دوسروں کا دکھ محسوس کرنا آتا ہے لیکن کتنی عجیب بات ہے نا ثانیہ کہ ہم جو غیروں کا دکھ بانٹنے نکلی ہو' اپنوں کا دکھ نہیں سمجھتیں۔ تمہیں خیال ہی نہیں آتا کہ تمہاری یہ اجاڑ زندگی تمہارے اپنوں کے لیے کتنی اذیت کا باعث ہے۔" صبوحی نے اس کی بات کو پکڑ کر اسے سمجھانے کا فریضہ انجام دینا شروع کر دیا تھا۔

"میں اس معاملے میں خود کو بے اختیار پاتی ہوں آپی!" ثانیہ نے نظریں چرائیں۔

"میں اسے بے اختیاری سے زیادہ ضد سمجھتی ہوں۔ کسی سے اس انداز میں محبت کرنا کہ باقی سارے رشتوں اور محبتوں کو نظر انداز کر دیا جائے محبت کی توہین ہے۔ محبت تو نام ہی ایثار و قربانی کا ہے اگر محبت کرتے ہوئے ان جذبات کو فراموش کر دیا جائے تو محبت محبت نہیں خود غرضی کہلاتی ہے۔" صبوحی کا انداز نشتر چبھونے والا تھا۔ ثانیہ اپنی جگہ تڑپ کر رہ گئی مگر صبوحی جانتی تھی کہ یہ سب ضروری ہے۔

"آپ کو ایک بات بتاؤں آپی؟ یہ جو شہر میں اتنے رفاہی ادارے اور این جی اوز کام کر رہی ہیں' ان میں سے میں نے اپنے ادارے کا انتخاب کیوں کیا؟" ذرا دیر کی خاموشی کے بعد ثانیہ نے صبوحی کو مخاطب کیا تو صبوحی زبان سے کوئی سوال کرنے کے بجائے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میں نے اس ادارے میں جاب اس لیے کی کہ اس کا نام شارق احمد ویلفیئر ٹرسٹ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس نے اپنے شارق احمد کی یاد میں یہ ادارہ بنایا ہے؟ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ جس شارق احمد کے نام پر یہ ٹرسٹ قائم کیا گیا ہے' وہ کب اور کس حادثے کا شکار ہوا تھا لیکن میں اس ٹرسٹ کے لیے کام کرتی ہوں تو مجھے دلی سکون ملتا ہے' شارق کے بعد میری زندگی کے بس یہی دو ماہ جب سے میں نے اس ادارے کے لیے کام کرنا شروع کیا ہے میرے لیے سکون کا باعث بنے ہیں۔ اب آپ بتائیں کہ ایک ایسی لڑکی جس کے حواسوں پر ایک شخص اس بری طرح

چھایا ہوا ہے، کیسے کسی دوسرے شخص کے ساتھ اپنا رشتہ نبھا سکتی ہے۔"

ثانیہ کی آواز میں نمی سی تھی۔ صبوحی کا اپنا دل بھی رقت کا شکار ہونے لگا لیکن اس نے خود پر انتہا کا ضبط کیا اور ثانیہ کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"یہ مت سمجھنا ثانیہ! کہ مجھے تمہارے جذبات کا احساس نہیں ہے۔ میں سب جانتی ہوں، میں گواہ ہوں تمہاری اور شارق کی پاکیزہ محبت کی لیکن محبت بن باس لے لینے کا ہی تو نام نہیں۔ ہماری تربیت کا تو پہلا سبق ہی خود کو پس پشت رکھ کر دوسروں کو خوش رکھنا تھا اور یقین جانو، یہ میرا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ دوسروں کی خوشیوں کو مقدم رکھتے ہیں خود ان کے حصے میں بھی بالآخر خوشیاں ہی آتی ہیں۔ پھر تم یہ کیوں سوچتی ہو کہ اگر تم نے شادی کر لی تو تمہیں شارق کی محبت سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ محبت تو دل کی گہرائیوں میں بسنے والے جذبے کا نام ہے امی، چچی اور چچا جان تمہاری وجہ سے پریشان ہیں۔ یہ خوش ہوں گے تو جو سکون اور اطمینان تمہیں حاصل ہو گا اس کا دنیا میں کوئی نعم البدل ہو ہی نہیں سکتا۔"

صبوحی، ثانیہ کو سوچنے کے لیے بہت کچھ دے کر اس کے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد ثانیہ نے سر جھٹک کر ایک بار پھر اپنے کام میں منہمک ہو جانا چاہا لیکن اس کا بار بار ٹوٹتا ارتکاز ثبوت تھا کہ وہ ثانیہ کی باتوں کو مکمل طور پر جھٹکنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

☆ ☆ ☆

ثانیہ نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں سنایا تھا کہ مسرت بیگم کو ہونے والے ہارٹ اٹیک نے گھر کی فضا میں ہلچل سی مچا دی۔ بلڈ پریشر کی تو وہ ایک زمانے سے مریضہ تھیں، شارق کے بعد شوگر میں بھی مبتلا ہو گئیں۔ اب تک دواؤں اور احتیاط نے ان کے ان دونوں امراض کو قابو میں رکھا ہوا تھا لیکن صبوحی اور اس کے بچوں میں گم ہو کر جانے ان کے کھانے پینے میں بد احتیاطی ہوئی یا دوائیں باقاعدگی سے نہیں لی گئیں کہ بلڈ پریشر نے انتہائی حد تک بڑھ کر ان کے دل کو نشانہ بنا لیا۔

سارا گھر یک دم ہی اپنی اپنی مصروفیات ترک کر کے ان کی خدمت پر مامور ہو گیا۔ آخر کار جب ڈاکٹرز نے چار دن بعد انہیں خطرے سے باہر قرار دے کر آئی سی یو سے روم میں شفٹ کیا تو ان سب کی جان میں جان آئی۔ اور وہ لوگ آہستہ آہستہ اپنے معمولات کی طرف لوٹنے لگے۔ مسرت بیگم کی خدمت کی ذمے داری بھی سب نے مل جل کر بانٹ لی۔ صبوحی صبح سے شام تک ان کے پاس رکتی پھر ثانیہ آفس سے سیدھی ہسپتال پہنچ جاتی اور رات گیارہ ساڑھے گیارہ تک وہاں رہتی۔ رات کو میمونہ کو ہسپتال پہنچانے اور ثانیہ کو واپس گھر لانے کی ذمہ داری مبین احمد نے اٹھا رکھی تھی۔ حاذق صبح یونیورسٹی جانے سے پہلے اور وہاں سے واپسی میں ہسپتال کا چکر لگاتا تھا۔ شنید تھی کہ اب دو چار دن میں مسرت بیگم کو ہسپتال سے گھر منتقل ہونے کی اجازت مل جائے گی۔

ان کے ہسپتال میں قیام کا وہ شاید بارہواں دن تھا۔ حسب معمول صبوحی صبح سے ان کے پاس رکی ہوئی تھی۔ سہ پہر کے بعد اس کے موبائل پر اپنی بڑی بیٹی کی کال آئی۔

"مما! چھوٹی نانی کو فیور ہو رہا ہے۔ ان سے بیڈ پر سے اٹھا بھی نہیں جا رہا۔ آپ گھر آ جائیں۔"

میمونہ کی طبیعت کی خرابی کا اندازہ تو اسے صبح گھر سے نکلتے وقت بھی ہوا تھا لیکن طبیعت اتنی زیادہ خراب ہو جائے گی، یہ اندازہ نہیں تھا۔ وہ اپنے بچوں اور گھر کی طرف سے متفکر ہونے لگی مگر یہاں مسرت بیگم کو تنہا چھوڑ کر جانا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ حاذق بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہسپتال سے نکل کر آفس گیا تھا ورنہ وہ ہی یہاں رک جاتا۔

"تم گھر جاؤ۔ میری طبیعت اب اتنی خراب نہیں ہے کہ کسی کا رہنا بہت ضروری ہو۔ پھر نرسیں وغیرہ بھی خیال رکھتی ہیں۔ تم گھر جا کر اپنی چچی کو دیکھو اور بچوں کی بھی فکر کرو۔ ویسے بھی اب چند گھنٹوں کی بات ہے ثانیہ یہاں پہنچ جائے گی۔"

آخر کار مسرت بیگم نے ہی اسے اس کشمکش سے نکالا تو وہ ان کے اصرار پر گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔ راستے میں اس نے ثانیہ کے موبائل پر ٹرائی کیا کہ اسے آفس سے جلدی نکل کر ہسپتال پہنچنے کا کہہ سکے لیکن اس کا موبائل مسلسل آف جا رہا تھا۔ صبوحی نے اپنے پرس سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس کے آفس کا کارڈ نکالا اور وہاں کے نمبر پر فون کیا تو معلوم ہوا ثانیہ کسی عورت کے کیس کی پیشی کے سلسلے میں کورٹ گئی ہوئی ہے اور ابھی تک نہیں لوٹی۔ صبوحی نے اس کے لیے پیغام چھوڑ دیا کہ اب بس یہی ممکن تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بالکل خود فراموشی کے عالم میں ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اپنے اردگرد موجود ہجوم کے لیے بھی اس کے انداز میں لاتعلقی تھی۔ وہ لوگ کس کس انداز میں صاحب مزار کے سامنے اپنی حاجتیں بیان کر کے خود کو دھوکا دے رہے تھے، اس نے اس پر بھی غور نہیں کیا تھا۔ اپنی اس خود فراموشی کی حالت میں اسے یہ بھی احساس نہیں ہو سکا کہ شام کے سائے ڈھل کر رات میں بدل گئے ہیں اور مزار پر موجود رش کم ہوتا جا رہا ہے۔

وہ ان دو سیاہ پوشوں سے بھی بے خبر رہی تھی جو اسے اتنی دیر تک ایک ہی جگہ، ایک ہی انداز میں بیٹھے دیکھ کر چونک گئے تھے۔ آخر کار مزار پر عقیدت مندوں کی آمد کا سلسلہ بند ہو گیا، لوگوں کو اس خصوصی کمرے سے باہر نکال کر حجرے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

وہ خود پر ایسی بے حسی طاری کرنے کی کوشش کر رہی تھی جس میں سارے جذبات و خواہشات اور حالات و واقعات کا احساس مٹ جائے۔ لیکن اس کی یہ خود فراموشی بہت دیر سے تاک میں بیٹھے ان سیاہ پوش مجاوروں کے لیے مہمیز کا کام کر رہی تھی۔

وہ سمجھ سکتے تھے کہ یہ لڑکی ان کے لیے تر نوالہ ثابت ہو گی۔ چنانچہ وہ گھات لگائے بیٹھے رہے۔ آخر نصف شب کے بعد جب انہیں اطمینان ہوا کہ احاطے میں موجود دیگر لوگ سو چکے ہیں تو وہ چپکے سے اس کے قریب آئے اور ایک بڑی سی چادر اس پر ڈال کر اسے دبوچنے کی کوشش کی وہ جو اپنی دانست میں خود پر بے حسی طاری کر چکی تھی اس اچانک افتاد پر اضطراری طور پر چیخی۔

"کون ہے؟ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" ردِعمل میں فوراً ہی ایک بلند مردانہ آواز سنائی دی اور ساتھ ہی قدموں کی آواز بھی گونجی۔ حملہ آور مجاور برق رفتاری سے اسے چھوڑ کر بھاگے۔ قدموں کی آواز افتاں و خیزاں بیٹھی دانیہ حسن کے قریب آ کر رک گئی۔

"کون ہو تم؟" آنے والے نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔ حواس باختہ دانیہ کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی۔

"دیکھنے میں تو کسی اچھے گھر کی لگتی ہو۔ پھر یہاں اس طرح کیوں پڑی ہو؟" ملگجی روشنی میں اس کے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد آنے والے نے اس سے پوچھا۔ دانیہ اس سوال پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مت روؤ بیٹی! مجھے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟" ادھیڑ عمر شخص نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا۔ دانیہ شاید کسی غمگسار کی ہی منتظر تھی اس اجنبی کو اپنے سارے حالات سناتی چلی گئی۔

"یقیناً" تم پر بڑی مشکلیں پڑی ہیں لیکن اس طرح گھر چھوڑ دینا تو سراسر بے وقوفی ہے۔ اپنی بیوقوفی کا نتیجہ تو تم نے ابھی ابھی دیکھ ہی لیا ہے۔ عورت ذات کے لیے اس کے گھر کی چار دیواری سے زیادہ محفوظ جگہ کوئی نہیں ہوتی رہی تمہارے سکون کی تلاش والی بات تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ اس طرح اپنی ذات کو ناکارہ بنا کر کسی مزار پر آ بیٹھنے سے سکون مل سکتا ہے۔ اللہ نے انسان کو انسان کی فلاح کے لیے بنایا ہے اگر انسان اس مشقت سے بچ کر اس طرح دنیا تیاگ کر بیٹھ جائے تو دنیا کا کاروبار کیسے چلے؟ ہو سکتا ہے کہ میری بات سے تمہیں اختلاف ہو لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ دنیا والوں کے ساتھ رہ کر، دنیا داری کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے اللہ سے محبت نبھائی جائے تو ہی آدمی مقام انسانیت پر فائز ہوتا ہے۔ تم تو خوش نصیب ہو کہ دل عشق کی آنچ سے آشنا ہو چکا ہے۔ بس اب یہ کرو کہ اس عشق کو ایک بندے تک محدود رکھنے کے بجائے ساری انسانیت کے لیے وقف کر دو۔ یوں بھی کہتے ہیں نا کہ اللہ تک پہنچنے کا راستہ دکھی انسانیت کے دلوں سے ہو کر گزرتا ہے تو تم کوشش کرو کہ اس راہ پر چل سکو۔ اللہ کا قرب مل گیا تو سکون کا کوئی مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔" وہ بہت دھیمی آواز میں اسے سمجھا رہے تھے۔

"آپ کون ہیں؟" دانیہ حسن نے سر اٹھا کر ان سے پوچھا۔

"مسافر۔ ایک دوست سے ملنے آیا تھا مگر معلوم ہوا وہ اپنے سارے گھر والوں کے ساتھ لاہور گیا ہوا ہے۔ مشکل یہ آ پڑی کہ کسی مہربان نے جیب کاٹ لی۔ اللہ کا شکر ہے کچھ رقم میری دوسری جیب میں پڑی ہوئی تھی۔ مگر رات زیادہ ہونے کی وجہ سے جا نہیں سکتا تھا۔ رقم بس اتنی تھی کہ واپسی کا ٹکٹ لیا جا سکے۔ اللہ کا کرم کہ اس نے شب بسری کے لیے مجھے یہاں تک پہنچا دیا۔" وہ اپنی بات کہہ کر تھوڑا سا ہنسے۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ شاید اللہ نے اسی مقصد کے

لیے ہی آج آپ کو میری مدد کرنے بھیج دیا ورنہ جانے آج میرے ساتھ کیا ہو جاتا۔" دانیہ حسن نے جھرجھری سی لی۔

"شکر ہے تمہیں کسی نقصان کے بغیر ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ آؤ اب یہاں سے چلو۔ میں تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔" ادھیڑ عمر شخص کی اس پیش کش پر دانیہ فوراً" اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آج پہلی بار اسے اپنے اس گھر کی قدر محسوس ہو رہی تھی جس کے بارے میں وہ ہمیشہ شکوے شکایات میں ہی مبتلا رہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

دانیہ کی توقع کے خلاف رات کے اس پہر گھر پہنچنے پر اسے کسی قسم کی تفتیش کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس رات جیا اور حسن شیرازی کسی ایسے فنکشن میں شرکت کرنے گئے ہوئے تھے جہاں ان کی ساری رات گزر گئی تھی۔ گاڑی کے سلسلے میں وہ البتہ تھوڑی سی پریشانی کا شکار ہوئی۔ لاوارث کھڑی گاڑی کو علاقے کے تھانے والے اٹھا لے گئے تھے۔ بہرحال حسن شیرازی کی بیٹی کی حیثیت سے وہ اپنی گاڑی حاصل کرنے میں ناکام نہیں رہی تھی یہ اور بات کہ گاڑی کی واپسی خاصے نقصان کے ساتھ ہوئی تھی اور اسے اس کی مرمت پر ٹھیک ٹھاک رقم خرچ کرنی پڑی تھی۔ مگر اللہ نے اسے جس نقصان سے بچا لیا تھا اس کے سامنے یہ معمولی نقصان کچھ نہیں تھا۔ اس واقعے کے بعد سے اس کے اندر ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

اس نے جیا کی حرکتوں پر چڑنا اور حاذق احمد کی جدائی پر کڑھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ نئے سرے سے اپنی زندگی کو منظم کر رہی تھی۔ تعلیم کا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنے کے لیے اس نے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے اپنا فارم جمع کروا دیا تھا۔ قرآن کی تجوید، ترجمہ اور تفسیر سیکھنے کے لیے ایک دینی ادارے میں داخلہ لے لیا تھا۔ بدتمیز پہلے بھی نہیں تھی لیکن اب ملازموں کے ساتھ زیادہ مہربانی کا سلوک کرنے لگی تھی۔ خیرات وصدقات کا بھی اہتمام کرتی تھی۔ ادبی اور دینی کتب باقاعدگی سے اس کے زیر مطالعہ رہنے لگی تھیں۔ کبھی کبھی موڈ ہونے پر کچن میں جا کر کوئی ڈش بھی ٹرائی کر لیتی تھی۔

غرض اس کی زندگی اچھی خاصی منظم ہو گئی تھی مگر حاذق احمد کے نام کی کسک دل سے نہیں جاتی تھی۔ اس کسک کو مٹانا اس کا مقصود تھا بھی نہیں کہ اس کسک کے باعث ہی اس کے اندر کچھ نہ کچھ کرنے اور خود کو سدھارنے کی تحریک پیدا ہوئی تھی۔ شاید اب بھی وہ لاشعوری طور پر حاذق احمد کی پسند کے سانچے میں ڈھلنے کی کوشش کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیسی ہو دانیہ؟" آج کافی دن بعد اسد کا فون آیا تھا۔ جیل سے رہائی کے بعد وہ پاکستان میں نہیں رک سکا تھا اور امریکہ چلا گیا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں۔" دانیہ نے بشاشت سے جواب دیا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ بس کبھی کبھی اس گلٹ میں بھی مبتلا ہو جاتا ہوں کہ تمہارے ساتھ وعدہ کرنے کے باوجود تمہیں چھوڑ کر یہاں آ گیا ہوں۔" اسد نے افسردگی سے بتایا۔

"پتہ ہے بھائی! میں سوچتی ہوں کہ ہماری تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا۔ آپ نے لاکھ ضد کی مگر اپنا نقصان کرنے کے باوجود تقدیر کے لکھے کو نہیں ٹال سکے۔ میں اب کبھی کبھی غور کرتی ہوں تو مجھے لگتا ہے، پاپا سے زیادہ ہم لوگ غلطی پر تھے۔ ماں باپ تو اولاد کے لیے ان کے اچھے مستقبل کے خواب دیکھتے ہی ہیں مگر ہم جس طرح پاپا کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہوئے، اس سے ہم نے اپنا ہی نقصان کیا۔ شاید لاشعوری طور پر ہم بھی اس دولت کے غرور میں مبتلا تھے جو پیدا ہوتے ہی ہم نے اپنے اردگرد دیکھی۔ دولت کے زعم میں ہم نے بہت غلطیاں بھی کیں۔"

"مگر ضرورت پڑنے پر اس دولت سے ہم کچھ نہیں خرید سکے۔ اگر تم شارق احمد کے گھر والوں کی منت سماجت کر کے انہیں نہ مناتیں تو آج یا تو میں پھانسی چڑھ چکا ہوتا یا جیل میں چکی پیس رہا ہوتا۔" اسد نے دانیہ کی بات مکمل کی پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔

"میرے دل میں ایک خیال آتا ہے دانیہ! کیوں نہ ہم ایسا کریں کہ شارق احمد کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کریں۔ بے شک اس کے گھر والوں نے اس کا خون بہا قبول کیا، لیکن ہمارا فرض تو بنتا ہے کہ ہم اس کا یہ حق ادا کرنے کی کوشش کریں۔" اسد کی بات سن کر دانیہ نے خوشی محسوس کی۔ کم از کم اسے احساس تو تھا کہ اس سے کیا جرم ہوا ہے اور وہ تلافی کی ممکنہ کوشش بھی کرنا چاہتا تھا۔

"یہ بہت اچھا آئیڈیا ہے بھائی! اس آئیڈیے پر کام کرنے کے لیے میں آپ کے ساتھ پورا پورا کوآپریٹ کروں گی۔ بس آپ یہ بتائیں کہ اس کام کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا؟ پاپا سے تو ہم اس معاملے میں بالکل بھی کوآپریشن (تعاون) کی امید نہیں کر سکتے۔" دانیہ نے اسد کے خیال کو سراہنے کے ساتھ سب سے اہم مسئلے کی طرف اس کی توجہ مبذول کروائی۔

"فی الحال تو میں اپنے پرسنل اکاؤنٹ میں موجود رقم سے یہ کام شروع کروانا چاہتا ہوں۔ مزید سرمائے کے لیے میں پاپا سے بزنس میں موجود ممی کے شیئرز سے حاصل ہونے والے پرافٹ کی بات کروں گا۔ ممی نے اپنی ول (وصیت) میں شیئرز میرے نام لکھے ہیں اس لیے پاپا میری بات ماننے سے انکار نہیں کر سکتے۔"

اسد کا انداز بالکل دوٹوک تھا۔ دانیہ نے سمجھ لیا کہ وہ حسن شیرازی کے سامنے ایک بار پھر اپنی ضد منوانے کے لیے اڑنے والا ہے لیکن اس بار اس کی یہ ضد بے جا اور بے مقصد نہیں تھی، اس لیے دانیہ نے اسے ٹوکنا ضروری نہیں سمجھا۔

☼ ☼ ☼

"ویری گڈ۔ آپ نے بہت امپروو کیا ہے۔ آئی ہوپ کہ آپ بہت جلد خود سے اٹھ کر چلنے پھرنے لگیں گے۔ بس آپ کو اپنی ول پاور سے کام لینا ہوگا۔ ڈاکٹرز سے میری بات ہوئی تھی، انہوں نے بہت امید دلائی ہے۔"

حسن شیرازی کو فزیو تھراپسٹ کے بتائے گئے طریقے کے مطابق ہاتھ کو حرکت دینے والی ورزش کرانے کے بعد دانیہ نے ان سے یہ تسلی آمیز جملے کہے۔ اس کے اور اسد کے مابین ہونے والی گفتگو کے مطابق ابھی حسن شیرازی سے بات کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ حسن شیرازی پر صدمے کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

جس پر وہ حد سے زیادہ اعتماد کرنے لگے تھے، اس نے زیادہ سے زیادہ ثمرات سمیٹنے کے بعد اچانک ہی اصلیت پر اتر آئی۔ نکاح نامے میں اسے حق طلاق تفویض کرنے والے حسن شیرازی کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح اچانک سب کچھ سمیٹنے کے بعد اچانک ہی ان سے علیحدگی کا فیصلہ سنا دے گی۔ وہ بہت گھاگ بزنس مین تھے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ بہت ذہین اور چالاک مرد بھی عورت کے چلترپن کے آگے ہارتے رہے ہیں سو حسن شیرازی بھی جیا کی چال میں آ گئے تھے۔

اس کی بے وفائی سے زیادہ انہیں اپنے برسوں کے جمے جمائے بزنس کو لگنے والے دھچکے نے صدمہ پہنچایا تھا اور اس صدمے کا نتیجہ فالج کے شدید حملے کی صورت میں سامنے آیا تھا۔

"اسد بھائی سے میری بات ہوئی تھی۔ وہ فرسٹ اویل ایبل فلائٹ سے یہاں پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ آ جائیں گے تو ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" حسن شیرازی کی آنکھیں ندامت سے بھیگنے لگیں۔

"پلیز پاپا! آپ ٹینشن مت لیں۔ ٹینشن لینے سے آپ کی صحت کو نقصان پہنچنے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔" دانیہ نے ان کی آنکھوں کی نمی دیکھ لی تھی اس لیے انہیں سمجھانے لگی۔

"سب..... سب ختم ہو گیا۔" حسن شیرازی نے اٹکتے ہوئے یہ جملہ ادا کیا۔ دانیہ نے ان کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے شدید تاسف محسوس کیا۔ وہ شخص جس نے اپنی ساری زندگی دولت سے بڑھ کر کسی شے کو نہیں چاہا تھا اس دولت کے چھن جانے پر دکھی نہ ہوتا تو کیا کرتا۔

"کچھ ختم نہیں ہوا پاپا! بس تھوڑا سا نقصان ہوا ہے۔ آپ کا بزنس اتنا معمولی تو نہیں کہ وہ عورت سب کچھ سمیٹ لینے میں کامیاب ہو جاتی۔ آپ ٹھیک ہو جائیں پھر میں اور اسد بھائی آپ کے ساتھ مل کر دوبارہ کچھ سینبھال کر دیں گے۔ ویسے بھی ہم تین افراد کی فیملی کے لیے آخر کتنی دولت کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ بچا ہے، وہ بھی اتنا زیادہ ہے کہ ہم اپنے ساتھ ساتھ دوسرے بہت سے لوگوں کے بھی کام آ سکتے ہیں۔ کیا فائدہ ہے ایسی دولت کا کہ جو بینک لاکرز اور تجوریوں میں بھری رہے اور ہمارے اردگرد رہنے والے فاقوں سے مر جائیں۔ ہم نام کے ہی سہی مسلمان تو ہیں، ہمارا عقیدہ آخرت پر یقین بھی ہے تو پھر ہم اس دنیا کی عیاشی میں گم ہو جانے کے بجائے اللہ کی عطا کی گئی نعمتوں کو اپنی آخرت سنوارنے کے لیے کیوں نہ استعمال کریں۔"

حسن شیرازی کی آنکھوں میں نظر آتی سوچ کی پرچھائیاں گواہ تھیں کہ دانیہ کی اس وقت کی گئی نصیحت

نے کچھ نہ کچھ اثر تو کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

"میں یہاں ہمیشہ کے لیے رک جاتا لیکن میں جانتا ہوں کہ میں ہمیشہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ یہ ڈھائی ماہ جو میں نے یہاں گزارے ہیں' وہ بھی میرے لیے شدید آزمائش تھے۔ میں ہر بار گھر سے نکلتے ہوئے اس خوف میں مبتلا رہا کہ کہیں کسی جگہ ثانیہ سے سامنا نہ ہو جائے۔ میں اب زندگی میں کبھی بھی اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اس لیے مجھے یہاں سے جانا ہی ہو گا۔ مجھے امید ہے کہ تم یہاں کے معاملات اچھی طرح سنبھال لوگی۔"

اپنی پاکستان آمد کے ٹھیک ڈھائی ماہ بعد اسد شیرازی نے اپنے نئے گھر کے ٹیرس پر ثانیہ کے ساتھ چائے پیتے ہوئے اس سے یہ جملے کہے تھے۔ وہ ان ڈھائی ماہ میں بری طرح مصروف رہا تھا۔ حسن شیرازی کی صحت' بزنس کی ری اسٹیبلشمنٹ (Restablishment) اور شارق احمد ویلفیئر ٹرسٹ کا قیام ہر معاملے کو اس نے اس مختصر عرصے میں نمٹایا تھا اور ساتھ ساتھ دانیہ کو بھی ٹریننگ دیتا رہا تھا۔

"میں پوری کوشش کروں گی کہ آپ کو مایوس نہ کروں۔" دانیہ نے دور آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہوئے اسد کو جواب دیا۔ اس نئے گھر کے ٹیرس سے آسمان بہت صاف نظر آتا تھا یا پھر یہ تھا کہ اس کا زاویۂ نظر ہی بدل گیا تھا۔ گھر چھوڑتے ہوئے اس کے دل میں کوئی ملال شاید اب اس کی زندگی میں مادہ پرستی کی کوئی گنجائش نکلتی ہی نہیں تھی۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں وہاں جا کر کیتھرائن سے شادی کر لوں گا۔ وہ بہت شروع سے مجھے چاہتی ہے۔ میری محبت نے اسے اسلام کی طرف بھی راغب کیا ہے اگر میرے وسیلے سے وہ مسلمان ہو کر سیدھی راہ پا لیتی ہے تو شاید اللہ کے ہاں میری توبہ قبول کرنے کی کوئی گنجائش بھی نکل آئے۔" خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد اسد نے دانیہ کو اپنے نئے فیصلے سے آگاہ کیا۔

"میرے خیال میں آپ کا یہ فیصلہ بہت اچھا ہے اور آپ جس نیت سے یہ کام کرنے جا رہے ہیں وہ اللہ کو ضرور پسند آئے گی۔ وہ تو غفور و رحیم ہے اپنے بندوں کے گناہ بخشنے کے لیے ہر دم تیار رہتا ہے۔" دانیہ نے فوراً" اسد کو حوصلہ افزائی کی۔

"ہاں مگر حقوق العباد کا مسئلہ تو سب سے الگ ہے۔ جب تک شارق کے گھر والے اپنے دل سے میرا جرم معاف نہیں کریں گے' میرے دل کا بوجھ کم نہیں ہو گا۔ مگر سچ یہ ہے کہ میں اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پاتا کہ ان سے معافی مانگنے کے لیے بھی ان کے سامنے جا سکوں۔ اگر کبھی تمہیں موقع ملے تو میرے حصے کا یہ قرض ادا کرنے کی کوشش کرنا۔"

اسد جانے سے پہلے اور بہت سی ذمّے داریوں کے ساتھ یہ ایک اور ذمے داری بھی اس کے نازک شانوں پر دھر گیا تھا اور وہ اس کے جانے کے بعد بھی اس ذمے داری کو بھولی نہیں تھی' چنانچہ جب اخبار میں شارق احمد ویلفیئر ٹرسٹ کے لیے دیے گئے اشتہار کے جواب میں اسے ثانیہ احمد کی درخواست موصول ہوئی تو اس نے اسے اپائنٹ کرنے میں لمحہ بھی نہیں لگایا۔ یہ اپائنٹمنٹ ٹرسٹ کے منتظم کے ذریعے کیا گیا تھا' اس لیے ثانیہ کو کچھ خبر نہیں ہو سکی۔ دانیہ نے مزید احتیاط یہ برتی کہ ثانیہ کی موجودگی میں وہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ اب اسے ٹرسٹ کے انتظامات کا جائزہ لینا ہوتا تو شام پانچ بجے کے بعد یا چھٹی کے دن وہاں جاتی۔ کسی اور ذریعے سے ثانیہ کو حقیقت معلوم ہو جانے کا اسے اس لیے اندیشہ نہیں تھا کہ منتظم کے علاوہ ایک دو خاص افراد کو ہی یہ بات معلوم تھی کہ اس ٹرسٹ کے لیے فنڈز کہاں سے مہیا کیے جا رہے ہیں؟

مسرت بیگم کی بیماری کی خبر بھی اسے مل گئی تھی لیکن وہ خواہش کے باوجود انہیں دیکھنے نہیں جا سکی تھی۔ وہ بس گھر بیٹھ کر ان کی صحت یابی کے لیے دعا کرتی رہی تھی مگر شاید یہ اس کی خواہش کی شدت ہی تھی کہ ایک دن اس کا بھی انتظام ہو گیا۔ اس روز ادارے میں مقیم ایک بے سہارا عورت کے کیس کی سماعت کے لیے ثانیہ کورٹ گئی ہوئی تھی اور وہ خود ثانیہ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر ادارے میں موجود تھی جب اسے ثانیہ کے گھر سے آنے والی کال اور دیے گئے پیغام کی متعلق اطلاع ملی۔ اس کے ذہن نے بہت تیزی سے کام کیا۔ مسرت بیگم سے ملاقات کے لیے اس سے بہترین موقع نہیں مل سکتا تھا۔ وہ اس بات کا انتظام کر کے کہ ثانیہ کو فوری طور پر گھر سے آنے والا پیغام نہ مل سکے' ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

مسرت بیگم نے کچھ حیرت سے اپنے کمرے میں داخل ہونے والی اجنبی لڑکی کو دیکھا جو انہیں سلام کرنے کے بعد ساتھ لائے پھل' جوس کے ڈبے اور بسکٹس وغیرہ بیڈ کے ساتھ موجود ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔

"آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔ میں دانیہ حسن ہوں۔" اس نے اپنا تعارف کروایا تو مسرت بیگم چونک کر اٹھ بیٹھیں۔ وہ واقعی دانیہ حسن کو نہیں پہچان سکی تھیں۔ کئی سال پہلے مغربی لباس میں ان کے گھر آنے والی ماڈرن سی دانیہ حسن اور موجودہ دانیہ حسن میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ آج جو لڑکی دانیہ حسن کی حیثیت سے ان کی سامنے کھڑی تھی اس نے ہلکے رنگ کا ایک سادہ سی ڈھیلی ڈھالی آستینوں والی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور سر پر بڑا سا دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے ہوئے تھی۔

"جب سے آپ کی طبیعت کے بارے میں سنا تھا' آپ سے ملنے کے لیے بے چین تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ آپ کے گھر کا کوئی فرد مجھے یہاں برداشت نہیں کرے گا اس لیے آ نہ سکی۔ آج بس اتفاق ہی سے مجھے یہ موقع مل گیا۔" اب وہ بیڈ کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھی انہیں بتا رہی تھی۔

"یہ ڈر تو تمہیں مجھ سے بھی ہونا چاہیے تھا؟" مسرت بیگم نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں۔ مجھے آپ سے یہ ڈر نہیں تھا۔ میری آپ سے ایک ملاقات ہوئی تھی' وہ مجھے اب بھی یاد ہے۔ اس وقت میں میں نے دیکھا تھا کہ آپ میں کتنا صبر و برداشت ہے اس لیے مجھے معلوم تھا کہ آپ کو اگر میرا آنا برا بھی لگا تو آپ مجھے نفرت سے دھتکاریں گی نہیں۔" اس نے بے حد یقین سے کہا تو وہ اسے دیکھتی رہ گئیں۔

"آپ شاید یقین نہ کریں لیکن میرے دل میں آپ کے لیے بہت احترام ہے۔ اپنی ماں کو میں کئی سال پہلے کھو چکی لیکن آپ کا خیال جب بھی آتا ہے تو سوچتی ہوں کہ ایک ہستی موجود ہے جسے میں اپنی ماں کہہ سکتی ہوں۔"

"کیسے؟" مسرت بیگم حیران ہوئیں۔

"یہ میرے دل کا ایک بہت مقدس راز ہے۔" مسرت بیگم نے دیکھا یہ جواب دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی کی چمک جاگی تھی۔

"آپ کے پاس آنے کا ایک مقصد اپنے بھائی کا سونپا ہوا فرض بھی ادا کرنا تھا۔ جو کچھ ہوا' وہ اس پر بہت شرمندہ ہیں۔ ان کی ایک جذباتی غلطی اور جنون آپ لوگوں کے لیے جس عمر بھر کے دکھ کا سبب بنا' اس کی تلافی تو کسی صورت ممکن نہیں لیکن پھر بھی ہو سکے تو انہیں معاف کر دیجیے گا۔" وہ جھکی نظروں سے ان سے درخواست کر رہی تھی۔

"معاف تو ہم نے اسی وقت کر دیا تھا جب تم قرآن پاک کو درمیان میں لے آئی تھیں۔" انہوں نے اسے یاد دلایا۔

"اپنے اس عمل پر میں آج بہت شرمندہ ہوں۔ اس وقت میری جہالت کا یہ عالم تھا کہ میں قرآن پاک کے تقدس کو سمجھتی ہی نہیں تھی' اس لیے مجھ سے وہ گستاخی سرزد ہو گئی۔ ہر روز اپنی ہر نماز میں اللہ سے اپنی اس گستاخی کی معافی مانگتی ہوں۔" اس کی اس بات پر مسرت بیگم نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ وہ صرف باہر ہی سے نہیں اندر سے بھی بدل گئی تھی۔

"اچھا آنٹی! اب چلتی ہوں۔ ثانیہ تھوڑی دیر میں آپ کے پاس پہنچنے والی ہو گی۔ مجھے یہاں پا کر اسے یقیناً" برا لگے گا۔" اپنی یہاں موجودگی کے دوران زیادہ تر وہ خود ہی بولتی رہی تھی۔ مسرت بیگم نے بہت اختصار کے ساتھ گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ اس وقت بھی وہ اس کے جانے کا سن کر کچھ نہیں بولیں مگر انہیں حیرت تھی کہ اسے ثانیہ کی آمد کے وقت کے بارے میں کس طرح معلوم ہے؟

"یہ میرا وزیٹنگ کارڈ ہے۔ اگر آپ کا دل آمادہ ہو تو کبھی مجھ سے ملنے ضرور آئیے گا بلکہ نہیں بس آپ مجھے فون کر دیجیے گا۔ میں خود آپ سے ملنے آ جاؤں گی۔" روانہ ہونے سے قبل اس نے مسرت بیگم کے ہاتھ میں ایک آسمانی رنگ کا کارڈ تھمایا جو انہوں نے خاموشی سے تھام لیا اور اسے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے دیکھتی رہیں اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولتی دروازہ خود بخود کھل گیا۔ کھلے دروازے سے اندر آنے والا حازق احمد تھا جو پہلے دانیہ حسن کو وہاں دیکھ کر حیران ہوا اور پھر اس کے چہرے پر غصے کی سرخی دوڑ گئی۔ خود دانیہ کا اپنا یہ حال تھا کہ مانو جسم کا سارا خون نچڑ گیا ہو۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی؟ کہا نہیں تھا میں نے تم سے کہ آئندہ کبھی میرے سامنے نہ آنا لیکن تم میں اتنی غیرت ہی کہاں ہے؟ بتاؤ کیوں آئی تھیں تم یہاں؟

"تمہارا کیا کام ہے میری ماں کے پاس؟ کیا مجھ سے مایوس ہو کر تم انہیں اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کر رہی تھیں؟"

وہ قہر بن کر برس رہا تھا اور دانیہ حسن لب بیے کھڑی تھی۔ اس نے فقط ایک بار کے بعد دوبارہ حازق احمد کے چہرے پر نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ اب وہ اس حاجت سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اس نے اس راز کو پالیا تھا کہ جو من میں بستے ہوں انہیں دیکھنے کے لیے ظاہری آنکھوں کا استعمال ضروری نہیں ہوتا۔

"حازق! جانے دو بیٹا اسے۔" حازق احمد نہ جانے اور بھی کیا کچھ کہہ رہا تھا کہ یک دم مسرت بیگم نے دخل اندازی کرتے ہوئے اسے نرمی سے حکم دیا۔ حازق ماں کے حکم پر خاموش ہو گیا۔ دانیہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اپنی طرف سے تو اس نے پوری منصوبہ بندی کی تھی لیکن پھر بھی دھرلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کیوں آئی تھی یہ یہاں؟" اس کے جانے کے بعد حازق احمد نے مسرت بیگم سے پوچھا۔

"میری عیادت کے لیے۔" انہوں نے مختصر جواب دیا۔

"اور بھی کچھ کہہ رہی تھی؟" حازق ان کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔

"اپنی اور اپنے بھائی کی طرف سے معافی مانگ رہی تھی۔" انہوں نے بتایا۔

"مجھے تو لگتا ہے، یہ اس کا کوئی نیا ڈھونگ ہے۔" حازق نے خیال ظاہر کیا۔

"اتنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی بیٹا!" مسرت بیگم نے اسے ٹوکا۔

"آپ کچھ نہیں جانتیں امی! آپ کو کیا معلوم کہ اس لڑکی نے کس طرح میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ یونیورسٹی، محلے ہر جگہ پر میں بدنام ہونے لگا تھا۔ یہاں تک کہ یہ ایک دن چچا جان کے آفس میں بھی میرے پیچھے آ دھمکی تھی۔" حازق احمد نے شدید طیش کے عالم میں انہیں بتایا۔

"لیکن کیوں؟" مسرت بیگم کے سوال نے اسے احساس دلایا کہ وہ غصے میں ایک غلطی کر چکا ہے لیکن جواب تو دینا تھا کہ وہ اب بھی اس کی طرف سوالیہ نظروں سے تک رہی تھیں۔

"اس کا دعوا ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔" حازق احمد نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ تو مسرت بیگم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ دانیہ کی بہت سی باتیں جو وہ سمجھ نہیں پائی تھیں یک دم واضح ہو گئیں۔ وہ حازق احمد کی ماں تھیں اس لیے دانیہ حسن بھی انہیں ماں کا درجہ دے گئی تھی۔

وہ سر ہلاتے ہوئے بستر پر دراز ہو گئیں اور ساتھ ہی آنکھیں بھی موند لیں۔ بہت دیر بیٹھے رہنے کی وجہ سے انہیں نقاہت بھی محسوس ہو رہی تھی اور دوسرے وہ خاموشی اور یکسوئی سے اس معاملے کے بہت سے پہلوؤں پر غور بھی کرنا چاہتی تھیں۔ ثانیہ کی آمد کے بعد حازق وہاں سے چلا گیا تھا۔ ثانیہ بے شک ابتدائی مرحلے کے بعد اس کی موجودگی کی وجہ سے واک آؤٹ تو نہیں کرتی تھی لیکن اس کے انداز میں جو اجنبیت ہوتی تھی اس کی وجہ سے حازق خود ہی کوشش کرتا تھا کہ اپنی موجودگی سے اس کے اعصاب پر بوجھ نہ طاری ہونے دے۔

☆ ☆ ☆

"آپ... مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ سچ مچ مجھ سے ملنے آئی ہیں۔" مسرت بیگم کا والہانہ استقبال کرتے ہوئے دانیہ حسن کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ بے شک انہیں اپنا وزٹنگ کارڈ دے کر آئی تھی لیکن اسے امید نہیں تھی کہ مسرت بیگم خود سے اس سے ملنا پسند کریں گی۔ مگر وہ کم و بیش ڈیڑھ ماہ بعد اس کے آفس میں اس کے سامنے موجود تھیں۔

"تم خود ہی تو مجھے آنے کی دعوت دے کر گئی تھیں۔" مسرت بیگم اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولیں۔

"جی ہاں اور یقین جانیں، مجھے آپ کو یہاں دیکھ کر بے انتہا خوشی محسوس ہو رہی ہے۔" وہ زبان سے نہ بھی بتاتی تو اس کی کیفیت ہی اس کے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس نے جس محبت سے مسرت بیگم کا ہاتھ تھام کر انہیں صوفے تک پہنچایا تھا۔ اسے پرکھ کر محبت کی سچائی کو جھٹلایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

"میں بہت پہلے ہی تم سے ملنے آنا چاہتی تھی لیکن بیماری اور صبوحی کی پاکستان میں موجودگی کی وجہ سے ممکن نہیں ہو سکا۔ اصل میں صبوحی سوال بہت کرتی ہے اور میں تم سے سب کی لاعلمی میں ملنا چاہتی تھی۔"

مسرت بیگم کی بات پر دانیہ کا سر جھک گیا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ ان بہت اعلا ظرف خاتون کے اہل خانہ ان کی دانیہ سے ملاقات پر ضرور معترض ہوتے کہ ان کے لیے دانیہ حسن کا سب سے بڑا حوالہ اسد شیرازی کی بہن ہونا تھا۔

"میں آپ کے لیے کچھ منگواتی ہوں۔" خاموشی کے مختصر دورانیے کے بعد دانیہ خود کو سنبھالتی ہوئی اپنی میز تک گئی اور انٹر کام پر چائے کے ساتھ لوازمات بھیجنے کی ہدایات دینے لگی۔

"تم ہسپتال میں مجھ سے ملنے آئی تھیں تو اپنے پیچھے بہت سے سوالات چھوڑ گئی تھیں۔ میں ان سوالات پر غور کرتی رہی۔ میری فہم نے مجھے ان کے جوابات بھی بتائے۔ آج تمہارے پاس آنے کا مقصد تم سے اپنے سوچ گئے جوابات کی تصدیق کروانا ہے۔"

وہ واپس مسرت بیگم کے قریب آ کر بیٹھی تو انہوں نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ دانیہ ان کی بات پر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اس دن ہسپتال میں تمہاری آمد سے ظاہر تھا کہ تم وہاں باقی گھر والوں کی غیر موجودگی سے واقف ہو۔ ذرا سا سوچنے پر میری سمجھ میں آ گیا کہ تمہاری اس واقفیت کا ثانیہ کی جاب سے کوئی تعلق ہے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ثانیہ جس ادارے میں ملازمت کر رہی ہے اس کا نام شارق احمد ویلفیئر ٹرسٹ ہے۔ نام کی اس مماثلت کو ہمیشہ اتفاق سمجھنے کے باوجود اس دن مجھے ادراک ہوا کہ یہ ٹرسٹ کسی اور شارق احمد کے نام پر نہیں، بلکہ میرے بیٹے کے نام پر قائم کیا گیا ہے اور اس کو قائم کرنے والی تم ہو۔ میں تم میں آنے والی تبدیلی دیکھ چکی تھی۔ تمہاری شرمندگی بہت کچھ کہتی تھی۔ پھر حازق کے غصے نے مجھ پر ایک انکشاف اور کیا۔ اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے اندر آنے والی تبدیلی کا ایک بڑا محرک یہ محبت بھی رہی ہو گی۔ محبت ایسی ہی طاقت ور شے کا نام ہے جو آدمی کو اندر، باہر سے یکسر بدل ڈالنے کی طاقت رکھتی ہے۔"

مسرت بیگم کے اس قدر ٹھیک اندازوں پر دانیہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"حیران مت ہو۔ میں عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں زندگی کے تجربات اس میں واقعات کا صحیح تجزیہ کرنے کی صلاحیت کئی گنا بڑھا دیتے ہیں۔" مسرت بیگم نے اس کی حیرانی کو ملاحظہ کرتے ہوئے ایک اور اندازے کا تیر چلایا۔

اس بار دانیہ حسن اپنی جگہ پر بیٹھی نہ رہ سکی اور یک دم ان کے قدموں میں آ بیٹھی۔

"آپ کی ہر بات صحیح ہے۔ واقعی وہ ٹرسٹ شیرازی انڈسٹریز کے تحت ہی قائم کیا گیا ہے اور اس کا مقصد اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے اس بات کو راز میں رکھا تو صرف اور صرف اس لیے کہ میری نیت پر شک نہ کیا جائے اور حازق احمد اسے میری خود تک پہنچنے کی کوئی چال نہ سمجھیں۔ یقین جانیں کہ وہ ان کو پانے کا جنون تو کب سے سر سے اتر چکا ہے۔ اب جو جذبہ بچا ہے وہ اتنا خالص ہے کہ ساری عمر ان کے حکم تعمیل میں ان کے سامنے آنے کی خواہش بھی میرے اندر سے ختم ہو گئی ہے۔ میں اپنے جذبے کے اس خالص پن کے ساتھ بہت خوش ہوں اور ساری زندگی اس جذبے کے سہارے بہت آسودگی اور اطمینان کے ساتھ گزار سکتی ہوں۔" اس کی آنکھوں سے شفاف موتیوں جیسے آنسو ایک لڑی کی صورت گر رہے تھے۔ وہ آنسو اتنے شفاف تھے کہ مسرت بیگم ان میں چھپی اس کی ہر سچائی کو بہت واضح طور پر دیکھ سکتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

آج پہلی بار ثانیہ کو شارق احمد ویلفیئر ٹرسٹ کی ٹرسٹی کی طرف سے کال کیا گیا تھا۔ وہ بہت اشتیاق اور مستعدی کے ساتھ ملاقات کے لیے ان کے کمرے تک گئی تھی مگر وہاں موجود ہستی نے اسے گنگ سا کر دیا تھا۔ اس چہرے کو تو وہ اپنی زندگی میں کبھی بھی دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

حیرت کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھل کر وہ کمرے سے واپس باہر نکلنے کے لیے مڑی۔

"پلیز ثانیہ! چند منٹ میری بات سن جاؤ پھر چاہے اس کے بعد کبھی یہاں قدم نہیں رکھنا۔" دانیہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اسے روکا۔

"میں تمہاری کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔" ثانیہ نے تنفر سے جواب دیا۔

"لیکن مجھے تمہیں اپنی بات ضرور سنانی ہے کیونکہ اس بات کو کہے بغیر میرے شانوں پر موجود قرض کا بوجھ نہیں اترے گا اور تم زندگی بھر ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا رہو گی جس کے باعث مجھے یقین ہے کہ شارق کی روح بھی بے چین ہی ہو گی۔"

دانیہ کا دیا شارق کا حوالہ ایسا نہیں تھا کہ ثانیہ اس کا ہاتھ جھٹک کر وہاں سے جاسکتی۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی وہاں رک گئی۔

"مجھے حال ہی میں علم ہوا کہ تم ایک بہت بڑی غلط فہمی کی وجہ سے حازق احمد سے بدگمان ہو تم سمجھتی ہو کہ انہوں نے لالچ اور میرے حسن سے متاثر ہو کر اسد بھائی کو شارق کا خون معاف کر دیا تھا لیکن یہ سچ نہیں ہے۔ انہوں نے تو پاپا کی طرف سے بھجوایا ہوا بلینک چیک فوراً ہی رد کر دیا تھا اور میں جب خود ان کے پاس درخواست لے کر گئی تھی تب بھی انہوں نے انکار کر دیا تھا لیکن پھر وہ میرے ایک عمل کی وجہ سے اسد بھائی کو معاف کرنے پر مجبور ہو گئے۔" دانیہ اسے اپنی اس روز کی حرکت کے بارے میں بتانے لگی۔

"حازق احمد نے کسی لالچ کے باعث نہیں بلکہ صرف اور صرف قرآن کی حرمت کی خاطر میری بات مانی تھی اور ان کو اس حرمت کا اتنا پاس تھا کہ انہوں نے خود پر لگائے گئے الزام کو مٹانے کے لیے بھی اپنی زبان کو کھولنا گوارا نہیں کیا۔ تم اپنی ادھوری معلومات کے باعث کبھی ان کی اس اعلا ظرفی کو نہیں جان سکیں اور ایک بہت اچھے انسان سے بدگمان رہیں تمہارے اس رویے کے باوجود انہوں نے کوئی شکوہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ تمہارا خیال رکھتے رہے۔ یہاں تک کہ تمہیں تکلیف نہ پہنچے اس خیال سے انہوں نے میرے یونیورسٹی میں داخلے پر بھی پابندی عائد کر دی۔"

دانیہ نے وہ واقعہ بھی تفصیل سے ثانیہ کو سنا ڈالا جسے سن کر وہ اپنے اب تک کے رویوں پر دل ہی دل میں شرمندہ ہونے لگی۔

"حازق احمد اور مسرت آنٹی نے جس طرح قرآن کے تقدس اور حرمت کی خاطر میرے بھائی کا اتنا بڑا جرم بالکل غیر مشروط طور پر معاف کر دیا، وہ چیز میرے جیسی میٹریل ازم کی دنیا میں گزارنے والی لڑکی کے لیے بہت حیرت انگیز تھی۔ اس دن کے بعد میں تبدیلی کے کن کن مراحل سے اور کس کس طرح گزری، یہ ایک لمبی داستان ہے، جو اگر تم نے سننی چاہی تو میں کسی روز ضرور سناؤں گی لیکن اس وقت میں تم سے صرف ایک درخواست کرنا چاہتی ہوں اور وہ یہ کہ مجھ سے اور میرے بھائی سے چاہے جتنی نفرت کرو لیکن اس ٹرسٹ کو کبھی مت چھوڑنا۔ یہ ٹرسٹ تمہارے شارق کے نام سے قائم کیا گیا ہے اور اسے چلانے میں جس طرح تم میری مدد کرتی ہو، دنیا کا کوئی اور فرد ہرگز نہیں کر سکتا۔"

دانیہ کی اس بات پر ثانیہ کی آنکھوں کی حیرت اور بھی بڑھ گئی۔

"یہ سچ ہے ثانیہ! یہ ٹرسٹ تمہارے شارق کے ہی نام سے قائم کیا گیا ہے۔ وہ خون بہا جو شارق کے ورثاء نے قبول نہیں کیا اس کی ادائیگی خود پر فرض سمجھتے ہوئے ہم نے اس ٹرسٹ کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا آئیڈیا اسد بھائی نے دیا تھا۔ اس کے قیام کے لیے انہوں نے اپنے حصے کی ساری پراپرٹی وقف کر دی ہے۔ میں اور اباتو بس اس کے نگراں ہیں۔ زندگی آدمی کو کن کن مراحل سے گزار کر اسے یکسر تبدیل کر دیتی ہے۔ کبھی یہ جاننا ہو تو میرے پاپا سے ضرور ملنا۔ تم اپنے بہت سے رویوں اور فیصلوں میں لچک کی گنجائش محسوس کرنے لگو گی۔"

مسرت بیگم سے دانیہ کی ملاقاتیں اس روز اپنے آفس میں ہونے والی اس ملاقات تک ہی محدود نہیں رہی تھیں وہ دونوں اس کے بعد بھی کئی بار ملی تھیں۔ فون پر بات چیت تو تقریباً روزانہ ہی ہو جاتی تھی اس لیے دانیہ کو تمام حالات سے اچھی طرح واقفیت حاصل تھی۔ اس واقفیت کے باعث ہی وہ ثانیہ کو نصیحت کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ ثانیہ اور وہ دونوں ہم عمر ہی تھیں لیکن دانیہ زندگی کے جتنے تجربات سے گزر چکی تھی ان کے باعث اس کی ذہنی عمر ثانیہ سے کہیں زیادہ تھی۔

"میں چلتی ہوں۔" ثانیہ جو اب تک حیرت سے دانیہ کی باتیں سن رہی تھی یک دم ہی وہاں سے جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

اس بار دانیہ نے اسے نہیں روکا۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت ثانیہ پر جو انکشافات ہوئے ہیں ان کو سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے اسے تھوڑا سا وقت اور تنہائی درکار ہے۔

☆ ☆ ☆

"آؤ بھئی حازق! بیٹھو، تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" مبین احمد کے بلاوے پر حازق ان کے کمرے میں گیا تو وہاں ان کے ساتھ موجود مسرت بیگم اور میمونہ کی موجودگی نے اسے احساس دلایا کہ کوئی خاص معاملہ درپیش ہے۔ مبین احمد کی بات سے اس کے خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔

"اس وقت میرے پاس تمہارے لیے ایک بڑی خوش خبری تو یہ ہے کہ ثانیہ نے اظفر کا پرپوزل قبول کر لیا ہے۔ اس پرپوزل کو قبول کرنے کے لیے اس نے شرط رکھی تھی کہ اظفر پاکستان شفٹ ہو جائے۔ صبوحی نے آج شام ہی اطلاع دی ہے کہ اظفر اس شرط پر راضی ہے چنانچہ ثانیہ کا معاملہ تو طے ہی سمجھو۔ اب ثانیہ کے بعد ہم تمہاری ذمے داری سے بھی فارغ ہونا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھابی نے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔ ان شاء اللہ جلد تمہارا اس سے نکاح کر دیا جائے گا۔ رخصتی ثانیہ کی شادی کے ساتھ رکھی جائے گی تاکہ صبوحی بھی شرکت کے لیے یہاں آسکے۔"

مبین احمد کی دی اطلاعات حازق کے لیے حیران کن تھیں۔ ایک طرف ثانیہ کا شادی کے لیے راضی ہو جانا تعجب خیز تھا تو دوسری طرف اسے بتائے بغیر اس کی زندگی کے فیصلے صادر کر دینا عجیب، تر جس پر وہ خاموش نہیں رہ سکا اور بولا۔

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں چچا جان؟ اس طرح اچانک، مجھ سے کوئی مشورہ لیے بغیر میرے نکاح کا فیصلہ کب اور کس نے کیا؟"

"یہ فیصلہ ہم سب نے مل کر کیا ہے اور میرے خیال میں تمہارے بزرگ ہونے کی حیثیت سے ہم یہ حق رکھتے ہیں۔ ہاں اگر تمہاری کہیں اور مرضی ہے، تم کسی کو پسند کرتے ہو تو بتا دو، ہم نے جہاں بات کی ہے ان لوگوں سے معذرت کر لیں گے۔" مبین احمد کا لہجہ بڑا دوٹوک تھا۔

"یہ بات نہیں ہے لیکن مجھے علم تو ہونا چاہیے کہ آپ لوگوں نے میرے لیے کس مزاج اور عادت و اطوار کی لڑکی کو منتخب کیا ہے۔" حازق نہ چاہتے ہوئے بھی جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کر گیا۔

"لڑکی بہت سلجھی ہوئی اور نیک ہے۔ اس کی سمجھ داری اور معاملہ فہمی کا اندازہ اس بات سے کر لو کہ اس کے سمجھانے پر ثانیہ شادی پر راضی ہو گئی ہے۔ ویسے بھی کیا تم ہم سے یہ امید رکھ سکتے ہو کہ ہم تمہارے لیے کسی ایسی لڑکی کا انتخاب کریں گے جو تمہارے مزاج سے میل نہ کھاتی ہو؟"

مبین احمد کے اس سوال پر حازق گڑبڑا گیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ آج مسرت بیگم نے خود تنہا اس کی شادی کے مسئلے پر بات کرنے کے بجائے یہ سہ رکنی کمیٹی کیوں تشکیل دی ہے۔ کمیٹی کی سربراہی کا فریضہ انجام دینے والے مبین احمد کے سامنے وہ زیادہ بحث نہیں کر سکتا تھا، وہ بھی اس صورت میں کہ اس کے پاس کوئی معقول دلیل موجود نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے۔ جو آپ لوگوں کا دل چاہے وہ کریں۔" کچھ نہ سوجھنے پر وہ قدرے ناراضی سے اپنی رضامندی ظاہر کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکل گیا۔ مگر کچھ ایسا تھا جو مسلسل اسے چبھ رہا تھا۔ کیا؟ وہ شاید یہ بھی نہیں سمجھنا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"حازق احمد ولد متین احمد، آپ کو دانیہ حسن بنت حسن شیرازی بعوض مہر ایک لاکھ روپے سکہ رائج الوقت اپنے نکاح میں قبول ہیں؟" نکاح خواہ کی زبان سے نکلے یہ الفاظ حازق احمد کو کسی ڈنک کی طرح لگے تھے۔ نکاح کی تقریب کے سلسلے میں ہونے والی تیاریوں میں وہ شامل نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کسی نے شامل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن نکاح خواں کے سامنے ایجاب و قبول تو اسی کو کرنا تھا اور وہ اپنے لیے منتخب کردہ لڑکی کا نام سن کر ہی شاکڈ رہ گیا تھا۔

"ہاں کہو حازق!" اس کی خاموشی پر اس کے بالکل برابر میں بیٹھے مبین احمد نے سرگوشی کی تو اس نے رخ موڑ کر انہیں شکوہ کناں نظروں سے دیکھا۔

"کیا تمہیں ہم پر اعتبار نہیں ہے؟"

مبین احمد نے اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے سرگوشی میں ہی سوال کیا۔ حازق احمد اس سوال کا جواب نفی میں ہرگز نہیں دے سکتا تھا، سو خاموشی سے نکاح خواں کی طرف متوجہ ہو گیا اور تین دفعہ ہاں کہنے کے ساتھ نکاح نامے پر دستخط بھی بلا چوں چرا کر ڈالے مگر اندر سے وہ بہت ناراض تھا اور اس کی یہ ناراضی اس کے ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔ اپنی اس ناراضی کے باعث وہ حسن شیرازی کے علاوہ مبین احمد سے بھی بہت بے دلی سے گلے ملا تھا۔ انہیں جیسے پروا ہی نہیں تھی۔ وہ حسن شیرازی کا تقریباً ناکارہ ہاتھ تھامے بہت محویت سے ان کی کچھ کچھ اٹک کر کی جانے والی باتیں سن رہے تھے۔

حازق ان کی اس بے نیازی پر اپنی جگہ بیٹھا کڑھتا رہا۔ سب کے اصرار کے باوجود کھانا بھی دو تین لقموں سے زیادہ

نہیں کھایا۔ اسی وقت اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی اس نے دیکھا' کال ثانیہ کی طرف سے کی جا رہی تھی۔ بہت جلے ہوئے انداز میں اس نے کال ریسیو کی اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں ہیلو بولا۔

"حاذق بھائی! ذرا اپنی جگہ سے اٹھ کر پچھلی جانب آئیں۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔"

ثانیہ کو گویا اس کے موڈ کی پروا ہی نہیں تھی۔ مزے سے اپنی بات کہہ کر لائن کاٹ دی۔ حاذق کو ناچار اس کی بات پر عمل کرنا پڑا۔ ابھی کچھ ہی دن تو ہوئے تھے ثانیہ کو اس سے نارمل رویّہ اختیار کیے ہوئے۔

"مجھے معلوم ہے' آپ بہت ناراض ہوں گے لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کی یہ ناراضی زیادہ دیر قائم نہیں رہے گی۔ آئیں میرے ساتھ اندر چلیں۔" ثانیہ اس کا سوجا ہوا منہ دیکھ کر بولی اور اس کا ہاتھ تھام کر پچھلے دروازے سے اسے اندر لے جانے لگی۔ تقریب حسن شیرازی کے گھر میں ہی منعقد کی گئی تھی جس میں مردوں کے لیے باہر لان میں اور عورتوں کے لیے گھر کے اندرونی حصے میں انتظام کیا گیا تھا۔

"تم لوگوں کو میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم لوگوں نے سوچا بھی کیسے کہ میں شارق کے قاتل کی بہن کو اپنی شریکِ حیات بنا سکتا ہوں؟" حاذق اندر سے بھرا ہوا تھا' اس لیے ثانیہ کے ساتھ قدم آگے بڑھانے کے بجائے اس پر اپنا غصہ نکالنے لگا۔

"دانیہ کا اسد شیرازی کی بہن ہونا اسے مجرم نہیں ثابت کر سکتا۔ نہ تو وہ اپنے بھائی کے جرم میں شریک تھی اور نہ ہی اس نے اسے اس جرم پر اکسایا تھا۔" ثانیہ نے بھی اپنے قدم روک لیے اور بہت سنجیدگی سے حاذق کو جواب دیا۔

"تم..... تم یہ بات کہہ رہی ہو؟ جسے دانیہ کل شکل بھی دیکھنا گوارا نہیں تھا۔" حاذق حیران ہوا۔

"وہ میری بے وقوفی اور جذباتی پن تھا۔" ثانیہ نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

"لیکن میں اب بھی اس کی شکل دیکھنا پسند نہیں کرتا۔" حاذق حیرت کے جھٹکے سے سنبھل کر اڑیل پن سے بولا۔

"صرف اس لیے کہ وہ ایک قاتل کی بہن ہے۔ قاتل بھی وہ جو جسے آپ قرآن کے نام پر معاف کر چکے ہیں لیکن یہ کیسی معافی تھی جو صرف زبان سے عطا کی گئی۔ آپ کا دل آپ کے اس فیصلے میں شامل نہیں ہوا جس پر قرآن کو گواہ بنایا گیا اور وہ بے وقوف لڑکی دانیہ احمد آپ کی قرآن سے وہ نمائشی محبت دیکھ کر اتنی متاثر ہوئی کہ آپ کے عشق میں مبتلا ہو گئی۔" ثانیہ کے لہجے میں بہت تلخی تھی مگر حاذق احمد اس تلخ سچ پر جلبلا گیا اور بولا۔

"فضول باتیں مت کرو۔ میں دانیہ حسن کو اسد شیرازی کی بہن ہونے کے علاوہ بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ لڑکی میرے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ جس نے پور پور خود کو آپ پسند کے سانچے میں ڈھال لیا ہے' وہ آپ کی پسند کے معیار پر پوری نہ اترے۔ اس نے آپ سے اتنی محبت کی ہے حاذق بھائی! کہ اسے اللہ نے اپنی محبت سے نواز دیا ہے۔ وہ اپنی زندگی کا ہر کام اللہ کی پسند کے مطابق کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کوشش میں اس نے اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی بدلنے کی جدوجہد کی ہے۔ آپ کبھی حسن انکل کے ماضی سے ان کے حال کو کمپیئر کر کے دیکھیے گا۔ آپ جان لیں گے کہ اس خاندان میں کتنی تبدیلی آئی ہے۔ ایک ایسی لڑکی جو اللہ کے احکام کی تعمیل میں اپنے ساتھ ساتھ اپنے گھر والوں کو بھی بدل ڈالے اس سے بڑھ کر اچھی لڑکی کون ہو سکتی ہے؟ اور اس سے بڑھ کر آپ کی پسند کا معیار کیا ہو سکتا ہے؟"

ثانیہ کے سوالات حاذق کو حیرت میں مبتلا کر رہے تھے۔ آخر ثانیہ کو اتنا سب کچھ کیسے اور کیونکر معلوم ہوا تھا' وہ بھی اس طرح کہ وہ سب کچھ بھلا کر دانیہ کی حمایتی بن بیٹھی تھی۔ وہ اپنا یہ سوال زبان پر لائے بغیر نہیں رہ سکا۔

"اسے معاف کر دینے کی دو وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ میری نظر میں قرآن پاک کی بہت عزت ہے۔ جب آپ نے اور بڑی امی نے قرآن کے نام پر اسد شیرازی کو معاف کر دیا تو پھر میں کون ہوتی ہوں کہ مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی دانیہ کو مجرم ہی گردانتی رہوں۔ پھر دوسری چیز جس نے میرے دل سے رہا سہا شکوہ بھی دور کر دیا' وہ اس کا شارق کے نام سے قائم کردہ ویلفیئر ٹرسٹ ہے۔ وہ جو ہم شارق سے محبت کا دعوا رکھتے ہوئے نہیں کر سکے وہ اسد شیرازی اور دانیہ نے کفارے کے طور پر کر ڈالا۔ اور آپ کو پتا۔ یہ وہ بات جو آپ سب مل کر مجھ سے نہیں منوا سکے دانیہ نے منوالی۔ صبوحی آپی کی باتوں نے بھی مجھے متاثر کیا تھا لیکن میرے دل پر آخری ضرب دانیہ نے لگائی۔ اس نے اپنی زندگی بھر کے تجربات میرے سامنے رکھ کر مجھے یہ رمز سکھایا کہ تقدیر کے آگے سرنگوں ہو جانے میں ہی انسان کی عافیت ہے۔ جو لوگ تقدیر کے آگے نہیں جھکتے' وہ نقصان کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں کر پاتے۔"

اس بار حاذق کچھ بھی نہیں بول سکا تھا۔ شارق کے نام سے ویلفیئر ٹرسٹ کے قیام نے اسے بھی بے حد متاثر کیا تھا۔

"دانیہ بہت پیاری لڑکی ہے حاذق بھائی! ہم سب نے اس کی اچھائی کو جان کر اسے قبول کر لیا ہے۔ آپ بھی ایک بار اسے سمجھنے کی کوشش کریں' آپ کو اپنی خوش نصیبی پر رشک آئے گا۔ اتنا چاہنے والا اور باکردار و بااخلاق ساتھی اللہ کا انعام ہوتا ہے۔ آپ کو بن مانگے یہ انعام مل رہا ہے اسے ٹھکرا کر خود کو ناشکروں میں شامل مت کیجیے گا۔"

حاذق کو یہ نصیحت کرتے ہوئے ثانیہ کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ اس نے اپنی محبت کو کھونے کا دکھ اٹھایا تھا۔ اس سے بڑھ کر کون اس دکھ کی کسک جان سکتا تھا۔ شاید اسی لیے وہ آج اتنے بھرپور طریقے سے دانیہ کی وکالت کر رہی تھی۔ ادھر حاذق احمد کے دل پر پڑا قفل بھی کھل گیا تھا اور وہاں موجود دانیہ حسن کی محبت خود اس کے اپنے اوپر عیاں ہونے لگی تھی۔

اسے یاد آیا تھا کہ کیسے وہ اس لڑکی کی دیوانگی پر چڑنے کے باوجود اس کی کمی کو محسوس کرتا تھا۔ دستک تو اس نے اس وقت بھی اس کے دل پر دی تھی لیکن وہ نفرت اور غصے کا راگ الاپتا اس دستک کو نظرانداز کر گیا تھا مگر اب واقعی کیا گنجائش تھی کہ وہ اس لڑکی کو جو خالصتاً" بنائی ہی اس کے لیے گئی تھی مسترد کر دیتا۔

"تم مجھے اندر کس کے پاس لے جا رہی تھیں ثانیہ!" پوری گفتگو کے دوران پہلی بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جاگی اور اس نے بہت نرمی سے ثانیہ سے پوچھا۔

"میں آپ کو دانیہ کے پاس لے جانا چاہتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آپ اسے دیکھیں گے تو اپنے انکار پر قائم نہیں رہ سکیں گے۔" ثانیہ نے اس کے لہجے کی تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے بتایا۔

"چلو تو تمہارے اس یقین کو بھی آزما لیتے ہیں۔" حاذق نے شوخی سے کہتے ہوئے قدم آگے بڑھائے۔ ثانیہ خوش خوش اس کے ساتھ تھی۔

"دانیہ! دیکھو حاذق بھائی تم سے ملنے آئے ہیں۔" ایک کمرے کا دروازہ وا کرتے ہوئے اس نے باہر سے ہی باآواز بلند ہانک لگائی۔

"اوں ہوں۔ گستاخ لڑکی! دانیہ نہیں بھابی کہو۔" حاذق نے اسے ٹوکا تو وہ ہنس دی لیکن اب حاذق اس کی طرف نہیں سامنے گھبرائی شرمائی' عروسی لباس میں اپنے حسن کی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ کھڑی دانیہ کی طرف متوجہ تھا۔ وہ حسن جو اپنی بے باکی میں کبھی اسے متوجہ نہیں کر سکا تھا۔ آج یوں شرمایا ہوا بڑا پُرکشش اور پُرلطف لگ رہا تھا۔ ثانیہ نے ذرا زور سے کھنکھارتے ہوئے حاذق کو اس کی اس محویت کا احساس دلایا۔

"یار ثانیہ! ذرا صبوحی کو فون تو کرو۔" وہ دانیہ پر سے نظر ہٹائے بغیر ثانیہ سے بولا۔

"وہ کیوں؟" ثانیہ کو حاذق کے مطالبے پر حیرت ہوئی۔

"اس سے کہنا ہے کہ فوراً" آجائے۔ ورنہ رخصتی کے لیے اپنی موجودگی کی شرط سے دست برداری اختیار کر لے۔"

حاذق کی بات پر ثانیہ بہت زور سے کھلکھلا کر ہنسی جبکہ دانیہ نے شرما کر اپنا سر کچھ اور جھکا لیا۔ اس کے شرمانے کی یہ ادا اتنی پیاری تھی کہ حاذق احمد کو یقین آگیا کہ اس نے اپنے لیے جس باحیا اور باکردار شریکِ حیات کی تمنا کی تھی' وہ دانیہ کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ بہت استحقاق سے اس شرمیلے حسن کو اپنی نظروں سے دل میں سمونے لگا۔